

اسلامی ریاست میں

نظامِ تعمیرِ اہلِ عالم

مسلم صحابہ

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

© جملہ حقوق محفوظ
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد
طبع اول: ۱۹۸۶ء
طبع دوم: ۱۹۹۲ء
طبع سوم: ۱۹۹۶ء

ISBN: 969-448-048-1

کتاب : اسلامی ریاست میں نظام تعلیم
سلسلہ : تعلیم اسلامی تناظر میں (مجلہ ۳)
مرتب : مسلم سجاد، سلیم منصور خالد

زیر اہتمام : انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

نصر چیمبرز، بلاک ۱۹ مرکز ایف سیون، اسلام آباد

فون: ۸۱۴۷۱۱-۸۱۸۲۳۰، فیکس: ۸۲۳۷۰۴-۵۱

E-mail: postbox@ips.isb.erum.com.pk

طابع : شرکت پرنٹنگ پریس نسبت روڈ، لاہور

تقسیم کنندہ : بک پروموترز
نصر چیمبرز، بلاک ۱۹ مرکز ایف سیون
فون: ۸۲۳۰۹۴، اسلام آباد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

پروفیسر غور شید احمد

چیتہ مینس انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں اگر کسی ایک تہہ تر ترین تاریخ ساز عامل کی تلاش کی جائے تو یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس میں سرفہرست تعلیم آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان کو اپنا خلیفہ اور نمائندہ مقرر کرنے کے لیے سب سے پہلے جس چیز سے اسے آراستہ کیا وہ علم تھا اور اپنے تمام انبیاء کو جو کام سونپا اس میں تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کو مرکزیت حاصل ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی اسلامی ریاست کی تعمیر و تشکیل کا آغاز مسجد نبوی کے قیام سے کیا جو اس نظر یاتی معاشرہ کی پہلی مسجد اور پہلا مدرسہ تھا۔ دوسری قوموں کی تاریخ میں بھی تعلیم کی یہ مرکزی حیثیت نمایاں نظر آتی ہے۔ مغرب کے دورِ جدید کا آغاز علمی نشاۃ ثانیہ سے ہوا۔ نیز بعد کے ادوار میں اور تقریباً ہر خطہ زمین پر تمام ہی اہم تہذیبی اور فنی ادوار و مراحل کی پشت پر یہیں ایک نیا علمی تحریک نظر آتی ہے۔

برصغیر پاک و ہند پر غلبہ کے بعد برطانوی سامراج نے بھی پہلا ہدف مسلمانوں کے تعلیمی نظام ہی کو بنایا۔ پُرانے نظامِ تعلیم سے لے کر رشتہ کو یک قلم کاٹ دیا گیا اور ایک بالکل نیا نظام رائج کیا جو ان کے مفید مطلب نسل تیار کر سکے۔ اس خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی نے کہا تھا کہ :

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

اور یہی ہوا، لیکن آزادی کے بعد اس ملک کی قیادت نے اس چیلنج کو کمیر نظر انداز کر دیا جس پر اس قوم کے مستقبل کا سب سے زیادہ انحصار تھا نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً چالیس سال کے بعد ہمارا نظامِ تعلیم نہ صرف یہ کہ ان تمام خرابیوں کا مرقع ہے جو سامراجی دور میں پیدا ہوئی تھیں بلکہ ان میں کیفیت و کمیت دونوں کے اعتبار سے بگاڑ میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ ہم نے محض نئے تعلیمی اداروں کے قیام کو تعلیمی ترقی سمجھ لیا ہے اور تعلیمی نظام کے تمام ہی بنیادی مسائل سے صرف نظر کر رکھا ہے۔ قوموں کی تاریخ میں اس سے بڑے سانحہ کا تصور بھی محال

نظامِ تعلیم کی تشکیلِ جدید کے لیے ضروری ہے کہ نئے نظام کا ایک مکمل خاکہ خواہ وہ مجمل ہی کیوں ہو موجود ہو۔ موجودہ نظام پر تنقیدی لٹریچر کی کمی نہیں لیکن اس امر کی ضرورت ایک مدتی محسوس ہو رہی تھی کہ اسلامی نظامِ تعلیم کا ایک مکمل خاکہ تیار کیا جائے۔ اس نظام کے مقاصد کی توضیح کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی واضح ہو سکے کہ اس نظام میں گھر، ذرائعِ ابلاغ، ماحول اور حکومت کا کیا کردار ہوگا۔ اُستاد، طالب علم، نصاب، درسی کُتب اور آلاتِ تدریس کی کیا شکل بنے گی۔ تعلیمی ماحول میں کیا تبدیلی ہوگی؟ اور حکومتِ تعلیم کے میدان میں کیا کردار ادا کرے گی؟ پھر ہمارے تعلیمی نظام کے کچھ مخصوص مسائل میں جن کا تعلق اس تاریخی پس منظر سے ہے جس میں یہ نظام قائم ہوا ہے۔ ان مسائل کو کیونکر حل کیا جائے گا۔ اس میں سرفہرست دو متوازی نظام ہائے تعلیم کا مسئلہ ہے جسے طبقاتی تعلیمی اداروں کے قیام نے اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس سوال پر بھی بحث کرنے کی ضرورت ہے کہ نجی تعلیمی اداروں کی کیا حیثیت ہونی چاہیے اور نظریاتی ریاست میں وہ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ نیز اسلامی نظامِ تعلیم میں شخصی آزادی کی کیا حیثیت ہوگی۔ یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا اس کی مالیات کی بنیاد فیس پر ہونی چاہیے یا پھر تعلیم نسواں اور مخلوط تعلیم کا مسئلہ ہے جس نے پریشان کن تعلیمی اور تہذیبی الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔ تعلیمی معیار اور تحقیق کے مستقبل کے مسائل سے بھی صرف نظر ممکن نہیں۔ یہ سارے معاملات ایسے ہیں جن پر خالص معروضی انداز میں غور کر کے اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی روایات کی روشنی میں بیسویں صدی کے اس آخری رُبع میں ایک اسلامی ریاست کے لیے نظامِ تعلیم کا نقشہ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

ان میں سے بیشتر مسائل پر الگ الگ گفتگو کی گئی ہے لیکن میرے علم میں ایسی کوئی کوشش نہیں جس میں ایک مقام پر ان مسائل کا احاطہ کیا گیا ہو۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی دعوت پر میرے محترم بھائی پروفیسر مسلم سجاد نے زیرِ نظر کتاب تیار کی ہے جو تعلیمی لٹریچر میں ایک منفرد اضافہ ہے۔ مسلم سجاد پچھلے ۲۰ سال سے تعلیم کے مختلف موضوعات پر لکھ رہے ہیں اور مخلوط تعلیم پر ان کا مقالہ علمی برادری سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ ان کی تازہ پیش کش تعلیمی افق پر ایک زرخشاں ستارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کتاب کا بغور مطالعہ کیا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع پر یہ ایک جامع ترین کتاب ہے جو صرف نظری امور ہی سے نہیں علیٰ مسائل سے بھی حقیقت پسندانہ انداز میں بحث کرتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ فلسفہ تعلیم کی بحث کو کچھ اور وسیع کیا جاتا لیکن وقت کی کمی کے باعث یہ نہ ہو سکا اور اس کتاب کی اشاعت میں مزید تاخیر مناسب نہیں۔ مجھے توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں مولف محترم اس طرف مزید توجہ دیں گے۔

فہرست

نظام تعلیم اور ریاست

- ۱۳ ○ مغربی جمہوری ریاست
- ۱۵ ○ اشتراکی ریاست
- ۱۵ ○ مسلم ممالک
- ۱۶ ○ اسلامی ریاست : نظام تعلیم کی اہمیت
- ۱۷ ○ غیر مسلم حکومت : مسلم اقلیت کی تعلیم

فلسفہ تعلیم

- ۲۳ ○ انسان بہ خیت خلیفہ اللہ فی الارض
- ۲۴ ○ دنیا ایک امتحان گاہ
- ۲۴ ○ راہ عمل : وحی الہی

مقاصد تعلیم

- ۳۳ ○ حصول علم
- ۳۷ ○ تزکیہ نفس
- صلاحیتوں کی نشوونما

- ۴۳ ○ ملی ضروریات کی تکمیل
- ۴۶ ○ قومی ضروریات کی تکمیل

غیر رسمی تعلیم

- ۵۹ ○ گھر
- ۶۹ ○ ذرائع ابلاغ
- ۷۷ ○ ماحول: معاشرے کی عمومی فضا
- ۷۹ ○ حکومت

رسمی تعلیم: چند بنیادی مسائل

- ۸۴ ○ دینی مدارس کا مقام
- ۸۸ ○ نظریاتی ریاست اور علمی آزادی
- ۹۰ ○ نجی تعلیمی ادارے اور اسلامی ریاست
- ۹۴ ○ طبقاتی تعلیم اور اسلامی نظام تعلیم
- ۹۶ ○ تعلیم: وسائل کی فراہمی کا مسئلہ

نظام تعلیم: بنیادی عناصر

- ۱۰۶ ○ استاد
- ۱۱۹ ○ طالب علم
- ۱۲۳ ○ نصاب
- ۱۴۴ ○ کتاب اور تدریسی آلات
- ۱۴۹ ○ ہم نصابی سرگرمیاں

○ حکومت اور تعلیمی انتظامیہ ۱۵۶

○ معاشرہ ۱۶۵

چند اہم امور اور اسلامی نقطہ نظر

○ عام خواندگی اور تعلیم بالغاں ۱۷۰

○ تعلیم نسواں ۱۷۸

○ مخلوط تعلیم ۱۸۷

○ اقامت گاہیں ۱۸۹

○ سہولتوں کی فراہمی ۱۹۳

○ تعلیمی معیار ۱۹۵

○ جدید تحقیقات سے استفادہ ۱۹۶

○ حکمت عملی ۱۹۹

نظام تعلیم اور ریاست



نظام تعلیم کی اصطلاح کو محدود معنوں میں ایسے تمام رسمی اداروں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو علم اور تہذیبی روایات کو منتقل کرتے ہیں اور افراد کے ذہنی اور اجتماعی نشوونما پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن وسیع تر مفہوم میں رسمی اداروں کے ساتھ اس میں متنوع قسم کے تمام غیر رسمی، اداراتی اور غیر اداراتی اثرات بھی شامل کئے جاتے ہیں۔ آج کے دور میں نظام تعلیم کی اصطلاح سے جو تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ کسی کتابی تعریف کا پر تو نہیں ہوتا بلکہ ہم خود جس نظام تعلیم سے گزرے ہیں اور مسلسل گزر رہے ہیں اور مطالعہ و مشاہدہ کی بنا پر جو کچھ جانتے ہیں اس کی بنیاد پر ہمارے ذہن میں تشکیل پاتا ہے اور یہ ایک انتہائی ہمہ گیر تصور ہے۔

اگر تاریخ کے اوراق پلٹے جائیں اور ہم پہلے انسان تک پہنچیں جو نبی کی حیثیت سے دنیا میں بھیجا گیا تھا تو کہا جاسکتا ہے کہ اولین نظام تعلیم ان تین اجزاء پر مشتمل تھا۔

- ۱۔ ازل میں ہر انسان سے خالق نے اپنی ربوبیت پر عہد لیا۔ الست پر حکم کے جواب میں بلی کہہ کر انسان نے اپنے رب کی ربوبیت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ معرفت رب ہر انسان کی سرشت میں موجود ہے اور اسے سوال جواب کے ذریعے سکھائی گئی ہے۔ اس کی روح اس پر گواہ ہے۔
- ۲۔ انسان اول کو اللہ تعالیٰ نے اشیاء کے نام سکھائے اور اس طرح فرشتوں پر اس کی ذہنی و فکری برتری واضح کی۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا۔ (البقرہ = ۳۱)
- یہ علم اشیاء تسخیر کائنات کی اصل ہے اور انسان کی تمام مادی ترقی کی بنیاد۔
- ۳۔ دنیا میں بھیجے ہوئے انسان کو کہا گیا کہ وہ پورے نظام ہدایت (افکار و اعمال) کی پیروی کرے۔

یہ ہے انسان کی تعلیم و تربیت۔ اس کے لئے وحی کا نظام قائم کیا گیا اور خوشخبری دی گئی کہ جو مہمایت پر چلے گا اسے کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ غم

فَمَنْ تَبَعَ هُدًى فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (بقولہ)

اس دُنیا پر پہلا انسان ہدایت لے کر آیا۔ پھر تاریخ نے اپنا سفر شروع کیا۔ انسان کی تہذیبی ترقی کے ساتھ ساتھ اجتماعیات کا تصور پیدا ہوا۔ ادارے بننے لگے اور علم اور تہذیبی روایات کی منتقلی محض ایک شاگرد اور استاد کا معاملہ نہ رہا۔ مرد چوپالوں میں بیٹھ کر داستانیں اور واقعات سناتے تھے بخورتیں چولھوں کے پاس بیٹھ کر کہانیاں اور قصے سناتی تھیں۔ اس طرح ایک نسل اپنی معلومات اور روایات دوسری نسل کو منتقل کرتی تھی۔ پھر انسان نے کاغذ بنایا طباعت کا آغاز کیا، عمارتیں بنائیں، آلات تیار کئے، تعلیمی ادارے کی حیثیت سے درس گاہ کا تصور پیدا کیا۔ دوسری طرف اجتماعیات کے تقاضوں کے تحت ریاست بنی۔ اس کا عمل دخل بڑھا۔ قوموں میں اپنی روایات کا شعور پیدا ہوا۔ ضروریات پورا کرنے کی فکر ہوئی۔ تعمیری طرف علوم کی حدود وسیع ہوتی گئیں۔ تحقیقات و ایجادات سے سرمایہ علم میں اضافہ ہوتا گیا۔ عرض ایک مسلسل عمل جاری ہوا اور ہم آج کے دور میں داخل ہوئے۔

تعلیم بذاتِ خود ایک ایسا عمل ہے جو اجتماعی تحریکات کو جنم دیتا ہے۔ یہ تحریکات معاشرہ کو ریاست کو اور خود تعلیم کو متاثر کرتی ہیں۔ اس طرح ایک باہمی عمل اور اس کے نتیجے میں تعلیم اور تعلیمی اداروں میں تبدیلی اور تسخیر کا عمل جاری رہتا ہے اور جاری ہے۔ اسلام خود ایک اجتماعی تحریک تھا جس کے اثرات معاشرہ پر اور ریاست پر پڑے۔ جدید دور کا آغاز صنعتی انقلاب سے ہوا۔ انگلستان میں نتیجے میں پبلک

اسکول قائم ہوئے۔ عیسائیوں کی Monasteries تعلیم کا مرکز بنیں۔ آکسفورڈ کیمرج جیسے ادارے

قائم ہوئے۔ فلاحی ریاست کے تصور کیساتھ ہر شہری کے لئے تعلیم کی سہولت کا تصور آیا اور Comprehensive سکول قائم کئے گئے۔ اشتراکیت کی تحریک نے تعلیم کو ہمہ گیر انداز سے متاثر کیا۔ جاپان کی مہجی تحریک محض ایک معاشی اور سیاسی نہیں بلکہ تعلیمی تحریک بھی تھی۔ ان تحریکات کے نتیجے میں اور ہر دور کے اپنے تقاضے پورا کرنے کے نتیجے میں تعلیم پر ریاست کی اثر اندازی میں اضافہ ہوتا گیا ہے۔

جدید دور میں کسی نظام تعلیم کا ریاست سے علیحدہ تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی تعلیمی ادارہ یا ادارے ریاست کے تعلیمی نظام سے بالکل آزاد ہو کر کام کرنا چاہیں تو قطع نظر اس کے کہ اس کی افادیت اور اہمیت

کیا ہوگی، سوال یہ ہے کہ کیا یہ عملاً ممکن ہے؟ اس طرح کے ادارے صرف اسی صورت میں کام کر سکیں گے، جب ریاست پالیسی کے طور پر خود اس بات کی اجازت دے کہ تعلیمی ادارے اس کے عمل دخل سے آزاد ہو کر بھی سرگرمی جاری رکھ سکتے ہیں۔ ایک فرد کے ذہنی و اجتماعی نشوونما پر ریاست کی اثر اندازی میں حیرت انگیز حد تک اضافہ ہو گیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنیکی ایجادات نے اس عمل کو تیز سے تیز کر دیا ہے۔ رسمی تعلیمی اداروں میں گزرنے والی مدت دو ڈھائی سال کی عمر سے شروع ہو کر بیس بائیس سال کی عمر تک ہو گئی ہے۔ یوں عمر کا ایک قابل لحاظ حصہ یہاں صرف ہوتا ہے۔ سرمایہ علم میں اضافہ کی وجہ سے تخصیص کا طریقہ اختیار کرنے کے باوجود انسان کے لئے اپنے دائرہ میں موجود علم کا احاطہ ناممکن ہی رہتا ہے لیکن بہر حال اس کے نتیجے میں حصول تعلیم کی مدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس طرح اثر اندازی بڑھ رہی ہے۔

ریاست چلانے کے لئے جن مردانہ کار کی ضرورت ہے وہ ان تعلیمی اداروں ہی سے تربیت پا کر نکلتے ہیں۔ آج کے دور میں اس امر کا امکان تقریباً نہیں کہ جو شخص اس تعلیمی عمل سے نہ گزرا ہو وہ قیادت کے مناصب حاصل کرے۔

یہی افراد طے کرتے ہیں کہ ملک کو اجتماعی زندگی کے کسی دائرہ میں کیا پالیسیاں اختیار کرنا ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی تعاون کے تحت ضروریات اور ترجیحات کا تعین ہوتا ہے اور اس کے لحاظ سے افراد کار کی تیاری کے لئے تعلیمی منصوبے بنائے جاتے ہیں اور ادارے کھولے جاتے ہیں۔ دوسری طرف ایک فرد خود بھی اپنی جگہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر اسے آگے بڑھنا ہے اور کوئی مقام حاصل کرنا ہے تو اسے اسی تعلیمی عمل سے گزر کر اپنے آپ کو ضرورت کے مطابق تیار کرنا ہوگا۔ اسی طرح ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جو تعلیم حاصل کرنے والوں کے درمیان ہی رہتا ہے۔

”ٹیکنیکی ترقی کی وجہ سے تعلیم کا عمل سادہ یا سستا نہیں رہا ہے۔ معیاری تعلیم کے لئے بے پناہ مالی وسائل کی حاجت ہوتی ہے۔ غریب قوموں میں تعلیم عام نہ ہونے کی یا اچھی تعلیم ہی نہ ہوسکنے کی ایک بڑی وجہ وسائل کی کمی ہوتی ہے۔ بہر حال جس درجہ کے وسائل کی ضرورت ہے وہ ریاست ہی فراہم کر سکتی ہے۔ یہ امر بھی ریاست کی اثر اندازی میں اضافہ کا باعث ہوا ہے۔

ریاست کی اثر اندازی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ رسمی تعلیمی اداروں سے باہر بھی ذہنی نشوونما پر بلاغ

عامہ کے جدید ذرائع مسلسل اثر انداز ہوتے ہیں۔ رسمی تعلیم کی مدت کے دوران اور اس کے بعد بھی ان ذرائع سے تہذیبی روایات کی منتقلی اور تعلیم و تفریح کا عمل فرد کی زندگی کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا دائرہ اثر غیر تعلیمیافتہ افراد تک براہ راست ہوتا ہے۔

جدید دور کے یہ عوامل آج کی ریاست کو افراد کی تعلیم میں اور انکی نشوونما میں فیصلہ کن کردار عطا کرتے ہیں لیکن اس صورت حال سے اہم مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

ریاست اس اثر اندازی کی قوت کو اپنے نظریہ کی ترویج اور استحکام کے لئے استعمال کر سکتی ہے ریاست تسلیم کرے یا نہ کرے کسی نہ کسی نظریہ کی علمبردار ہوتی ہے۔ ایسا نظریہ جو فرد کی آزادی کو سلب کرے ایسا نظریہ جو فرد کو بے حد آزادی دے اور ایسا نظریہ جو دونوں میں توازن قائم کرے۔ کوئی نظریہ نہ ہونا بھی عملاً ایک نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ریاست کی تمام اجتماعی پالیسیاں اسی نظریے کی منظر اور عکاس ہوتی ہیں۔

جدید دور کا ایک سوال یہ بھی ہے کہ ریاست خود کس حد تک مقتدر ہے اور کس حد تک سائنس اور ٹیکنالوجی کی جدید ایجادات کی وجہ سے کچھ دوسرے اداروں کی محتاج ہے۔ دوسرے انقلاب کے بعد تقریباً ہر دائرہ میں کمپیوٹر کے استعمال کے موجودہ دور نے فرد اور اجتماع کے تعلقات کو بھی کئی طرح متاثر کیا ہے۔ معاشرہ کی ایک نمائندہ طاقت ریاست اور اس کے براہ راست ماتحت ادارے ہیں اور دوسری طرف اس کی نمائندگی ایسے متعدد اور متنوع اداروں کے ذریعہ ہوتی ہے جو اپنی طاقت کے لحاظ سے ریاست سے کم طاقتور نہیں ہوتے۔

جدید دور کی مختلف طرز کی ریاستوں نے ان مسائل کو اپنے انداز سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے مسائل کو حل کیا ہے یا نہ نئے مسائل پیدا کئے ہیں اس کا ایک سرسری جائزہ لے کر ہم اسلامی ریاست میں تعلیمی نظام کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کریں گے۔

مغربی جمہوری ریاست

مغربی طرز کی جدید جمہوری ریاست میں فرد کی آزادی کے تصور کے تحت یہ کوشش کی جاتی ہے کہ فرد کو نشوونما کے لئے آزادانہ مواقع ملیں تعلیم کو ہر شہری تک پہنچایا جائے اور سب کو یکساں مواقع

فراہم کئے جائیں۔ بہتر سے بہتر سہولت کا انتظام کیا جائے۔ مذہب کو ہر شخص کا ذاتی معاملہ قرار دینے کے تصور کے تحت ان کی پالیسی میں زیرِ تعلیم افراد کے مذہب سے کوئی بحث نہیں ہوتی لیکن اس دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ کر گزارنے اور اپنے تصور کے تحت اسے بہتر سے بہتر گزارنے پر ہوتی ہے یا کسٹم کیلنکی ترقی، آسائش کے لئے ایک سے ایک ایجادات، مخالفین پر برتری کے لئے مؤثر سے مؤثر تباہ کن اسلحہ ان کی تعلیم کا ثمرہ ہیں۔ اس تعلیم کی بدولت علمی ترقی کی منازل طے ہوئی ہیں۔ اچھی اور معیاری تعلیم عام ہوئی ہے لیکن کسی مثبت نظریہ حیات کے نہ ہونے کی وجہ سے اس تعلیم کے، ذیل میں درج اثرا خود ان معاشروں کے لئے پریشانی کا باعث بن رہے ہیں۔

۱۔ افراد ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ اعلیٰ تصور حیات، اور مقصدِ زندگی کے فقدان کی وجہ سے وہ سکون سے محروم ہیں۔

۲۔ اجتماعی ذمہ داری اور اس کے تقاضوں کو ادا کرنے کا احساس نہیں ہے۔ ان کی پوری سوچ محض اپنی ذات کے گرد گھومتی ہے۔

۳۔ اعلیٰ اخلاقی اقدار ان کے نزدیک کوئی وزن نہیں رکھتیں۔ انسانی برادری کی ضروریات سے بے نیازی پائی جاتی ہے۔

۴۔ کسی بھی طرح کی پابندی کو قبول نہ کرنا، اور اس کی خلاف ورزی کرنا اچھا فعل سمجھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے خاندان اور معاشرہ کا شیرازہ منتشر ہے۔

۵۔ دو طرح کے تعلیمی ادارے، پرائیویٹ اور پبلک دو مختلف معیاروں کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور اس طرح خود جہوریت کی نفی ہوتی ہے۔

یہ وہ اثرات ہیں جو آج کے جدید مغربی معاشرہ پر تعلیم کے نظام کی وجہ سے، جو ان کی تہذیب کا اور اس کی اقدار کا نمائندہ ہے، پڑ رہے ہیں۔ بے خدا تہذیب، بے قید آزادی، اور لحد کے کسی محاسب سے عاری طرزِ فکر نے جو ریاست تشکیل دی ہے، اس نے تعلیمی نظام کو بھی انہی اقدار کی نشوونما کے لئے آزاد چھوڑا ہے۔

ان ریاستوں کے زیر اثر جن کی نمائندگی امریکہ و برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک کرتے ہیں، جن دوسرے ممالک نے جدید نظامِ تعلیم اختیار کئے ہیں وہاں جہوریت کی روایات نہ ہونے کی وجہ سے اس کی وہ شکل نہیں

من مکی ہے جو ان ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ مزید برآں یہ بھی کہ ایسے بیشتر ممالک میں بہت بڑی اکثریت ابھی سرے سے تعلیم کے قریب بھی نہیں آئی ہے۔

اشتراکی ریاست

اشتراکی ریاست، جس کی نمایاں مثالیں روس اور چین ہیں۔ نظریاتی ریاست ہوتی ہے اور نظام تعلیم پر اس کے نظریہ کی مکمل چھاپ ہوتی ہے۔ نظام تعلیم میں کسی بھی مرحلہ پر کوئی ایسی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ نہیں دی جاسکتی جو اشتراکی نظریہ کے خلاف ہو۔ بنی تعلیمی ادارے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، پورے نظام تعلیم کی مرکزی منصوبہ بندی ہوتی ہے اور اسے ہر طرح پابند رکھا جاتا ہے۔ ہر طرح کی مطبوعات اور ذرائع ابلاغ سو فیصد ریاست کے کنٹرول میں ہوتے ہیں۔ تمام انسانی اور مالی وسائل کو منصوبہ بندی کے ساتھ استعمال کرنے کی وجہ سے یہ ممالک سائنسی اور تکنیکی ترقی میں مغربی ممالک سے پیچھے نہیں ہیں۔ لہذا جمہوریت کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے اور کسی بھی طرح کی مذہبی تعلیم گوارا نہیں کی جاتی۔ تعلیم کو ریاست کے نظریاتی مقاصد کے حصول کا موثر ذریعہ قرار دیا جاتا ہے اور اس پر پوری توجہ دی جاتی ہے۔ خواندگی کی شرح ان ممالک میں بہت اچھی ہے۔

اشتراکی نظام تعلیم نے جو نسل تیار کی ہے اور جو معاشرہ تشکیل دیا ہے اس پر ان کے نظریہ کے گہرے اثرات ہیں۔ یہاں حقیقی اہمیت اجتماع کو حاصل ہے، فرد کو نہیں۔ فرد کی حیثیت ایک مشین کے پرزہ کی ہے جسے جہاں چاہے لگایا جاسکتا ہے۔ اس غیر متوازن طرز فکر نے اشتراکی معاشرہ کے افراد کی زندگیوں کو انتہائی تکلیف دہ بنا دیا ہے۔ وہ ایک ریاست کے شہری کے بجائے ایک پارٹی کے قیدی کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

مسلمان ممالک

درج بالا دو بنیادی طرز کے نظام ہائے تعلیم کے بیان کے ساتھ ساتھ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو جو مسلمان ممالک کے نظام ہائے تعلیم کا بھی اجمالاً تذکرہ کر دیا جائے۔ مسلم ممالک کو برطانیہ، فرانس، اٹلی یا الینڈ کے سامراج سے آزادی کے بعد (اور ترکستان کے مسلمان تو ابھی روسی استعمار کے شکنجے میں گرفتار ہیں! جو

نظام تعلیم و رشتہ میں ملا ہے وہ ابھی تک اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لاسکے ہیں۔ بلکہ ضرورت کے لحاظ سے کچھ ترمیمات کے ساتھ اسی کو نافذ العمل رکھے ہوئے ہیں اور اس کے زیر اثر عموماً اس نمونہ کے افراد تیار کر رہے ہیں جیسے کہ غلامی کے دور میں تیار ہوتے تھے۔ اگرچہ اعداد و شمار کے لحاظ سے وسعت پیدا ہوئی ہے لیکن بالعموم معیار گرا ہے۔ بعض ممالک نے وسائل کی کمی کے باعث اور بعض نے قرار واقعی اہمیت محسوس نہ کرنے کی وجہ سے اس تعلیم کو بھی عام نہیں کیا ہے۔ شرح خواندگی بیشتر ممالک میں مایوس کن حد تک کم ہے البتہ تیل کی دولت سے مالا مال ممالک نے اپنے ممالک میں تعلیم پر خاصی سرمایہ کاری کی ہے۔ مسلمان عوام کے دینی رجحانات اور مطالبات کے پیش نظر اکثر ممالک نے اسلامیات کے مضمون کو لازمی کیا ہے اور بعض دیگر اقدامات بھی کئے ہیں۔ ایسے مسلم ممالک بھی ہیں جہاں لادینی ذہن کے حکمرانوں کی وجہ سے یہ معمولی تبدیلی بھی نہیں ہو سکی ہے۔ نظام تعلیم کو مکمل طور پر اسلامی نظریہ کے مطابق ڈھلنے کا احساس کئی ممالک میں پیدا ہو رہا ہے، بعض حکمرانوں نے بھی اس سمت پیش قدمی کی کوشش کی ہے لیکن عملاً کسی مسلم معاشرہ میں کوئی ایسا نظام تعلیم قائم نہیں ہوا ہے جسے اسلامی نظام تعلیم کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاسکے۔

اسلامی ریاست میں نظام تعلیم کی اہمیت

ایک حقیقی اسلامی ریاست میں جہاں زندگی کے ہر دائرہ میں اسلام کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں عمل ہو رہا ہو، نظام تعلیم کی غیر معمولی اہمیت آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے۔ اسلامی ریاست نظریاتی ریاست ہوتی ہے۔ اسلامی نظریہ حیات اس کی تمام اجتماعی سرگرمیوں اور شہریوں کی انفرادی زندگی میں جاری نفاذ ہوتا ہے۔ اس ریاست کا اسلامی تشخص برقرار رکھنے کے لئے سیرت و کردار کے لحاظ سے اس کے افراد کا کو اسلامی طرز حیات کا نمونہ بنانے میں سب سے بڑا اور موثر حصہ نظام تعلیم کا ہوگا۔ اس ریاست کو اجتماعی زندگی کے ہر میدان کے لئے ایسے ماہرین مسلسل درکار ہوں گے جو اس کو اسلام کے حقیقی تصورات کے مطابق چلاتے رہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک ایسا نظام تعلیم موجود ہو جس میں اسلامی ریاست کی تمام ضروریات کے لئے افراد کو تیار کرنے کے لئے تعلیمی ادارے کام کر رہے ہوں۔ عمرانیات، معاشیات، قانون، طب، انجینئیری، انتظام حکومت اور تجارت کے دائروں میں ہر سطح کے تربیت یافتہ افراد

فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ سائنس، فنون اور اسلام کے تمام علوم میں اعلیٰ پایہ کے محققین کی ضرورت نظام تعلیم ہی پورا کرے گا۔

ایک حقیقی اسلامی ریاست میں خواندگی کی شرح سو فیصد رکھنے کے لئے ناگزیر ہے کہ بنیادی تعلیم کے اتنے مواقع فراہم کئے جائیں کہ تعلیم کی عمر کو پہنچنے والے ہر فرد کے لئے مناسب سہولت موجود ہو نظام تعلیم، کم یا زیادہ آمدنی رکھنے والے تمام خاندانوں کے بچوں کو یکساں معیار کی تعلیم فراہم کر کے صلاحیت کی بنیاد پر آگے بڑھنے کے مواقع دے گا اور اس طرح معاشرہ کو طبقاتی تقسیم یا کسی ایک مراعات یافتہ طبقہ کے مسلسل تسلط سے پیدا ہونے والے نقصان دہ اثرات سے محفوظ رکھے گا۔ اس طرح یہ نظام تعلیم معاشرتی عدل کو قائم کرنے اور اس کے تحفظ و استحکام کا ذریعہ ہوگا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی ریاست میں نظام تعلیم ہی اسلامی ریاست کو اسلامی ریاست بنانے اور رکھنے کا ضامن ہوگا۔ خدا اور رسولؐ کے فرمودات اپنی تاریخی روایات اور دورِ جدید کے تقاضوں کے بموجب تعلیم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگی۔ اس کے لئے وسائل فراہم کئے جائیں گے تاکہ انسانِ تین اور اعلیٰ ترین صورت اختیار کریں۔ ہر شخص کو تعلیم مہیا ہوگی اور یہ تعلیم ہی اس کو اسلامی معاشرہ کا حقیقی فرد بنائے گی۔ یہ نظام تعلیم ہی ہوگا جو اسلامی ریاست کو دنیا کی نام نہاد ترقی یافتہ قوموں سے زیادہ ترقی کی طرف لے جائے گا۔ لیکن ایسی حقیقی ترقی کی طرف جو اپنے شہریوں کے لئے نہ صرف دنیا میں بلکہ دوزخِ آخرت بھی فلاح کا باعث ہو کہ آخرت کی فوزِ عظیم ہی انسان کا اصل مقصد ہے۔

نظام تعلیم کی اس اہمیت کا یہ تقاضا ضرور ہے کہ اسلامی ریاست اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک کلیت پسند ریاست کی طرح وہ ہر طرح کی تعلیم کے پورے نظام کو کھلی طور پر اپنے قبضے میں رکھے۔ تعلیم فی الاصل ایک معاشرتی عمل ہے۔ ریاست کے دائرہ کار میں اضافہ کے نتیجے میں فطری طور پر اسلامی ریاست بھی ماضی کی روایات کے مقابلے میں زیادہ دخیل ہوگی لیکن اس کی کوشش اور منصوبہ بندی یہ ہوگی کہ معاشرہ اس ذمہ داری کی ادائیگی میں اپنا حصہ زیادہ سے زیادہ ادا کرے۔ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں فرد، اجتماع اور اجتماع کے ایک جزو کی حیثیت سے ریاست کا مقصود اور نصب العین ایک ہی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق دنیا میں ایسی حیوۃ طیبہ گزارنا کہ آخرت میں خالق کی رضا حاصل ہو سکے۔ اسلامی ریاست کی حیثیت

معلم کی ہے اس لئے کہ امام نبیؐ کا وارث ہوتا ہے اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام معلم بنا کر مبعوث کئے گئے تھے۔ مقصد کی یکسانیت تعلیم کے لئے ایسی منضبط اور متحدہ کوششوں کی ضمانت ہے جس میں ہر چیز کو اپنی مکمل کارکردگی کے اظہار کا موقع ملے۔

غیر مسلم حکومت میں مسلمان اقلیت کی تعلیم

نظام تعلیم کی اب تک کی بحث میں ہم نے اسلامی نظام تعلیم کو ایک ریاست کے نظام تعلیم کی حیثیت سے پیش نظر رکھا ہے۔ تعلیم کے ساتھ نظام کا لفظ ایک بات کو تصور میں لاتا ہے لیکن اسلامی تعلیم کا ایک ارہ لازمًا اس صورت میں بھی ہو گا کہ مسلمان کسی غیر مسلم مملکت میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہوں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کی حکمت عملی اس پر منحصر ہو گی کہ مملکت ان کو کتنی آزادی اور کون کون سے حقوق دے رہی ہے۔ آج دنیا میں اس نقطہ نظر سے مختلف نوعیت کی غیر مسلم حکومتیں موجود ہیں۔

۱۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان ریاست کے ذریعے اور اس کی مدد سے اپنے علیحدہ اور خود مختار تعلیمی ادارے قائم کر سکیں۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ریاست نے اتنی تعلیمی اور ثقافتی آزادی دے رکھی ہو کہ مسلمان خود منظم ہو کر اپنے لئے تعلیمی ادارے قائم کر سکتے ہوں۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تعلیمی و ثقافتی آزادی میسر نہ ہو اور اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے ممانعت ہو۔

تینوں صورتوں میں مسلم معاشرہ کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ اپنے بچوں کی اور نوجوان نسل کی عقلی و جسمانی اسلامی خطوط پر تعلیم و تربیت کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں اور ہر ممکنہ حد تک ذرائع و وسائل فراہم کر کے اس کیلئے انتظامات کرے۔

۱۔ ریاست مذہب کی بنیاد پر علیحدہ ادارے خود قائم کرتی ہو یا قائم کرنے کی اجازت دیتی ہو تو مسلمانوں کا یہ فرض ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور ان اداروں میں بنیادی تعلیم کے ساتھ اپنا ہر بھی سکھائیں کہ فارغ التحصیل نوجوان معاشرہ میں اپنی جگہ بنائیں اور اپنی ذات سے اسلام کی دعوت پھیلانے کا ذریعہ بنیں۔ معیاری ابتدائی تعلیم کے اداروں کا جال بچا دیں اور یہاں اتنی مضبوط بنیاد

فراہم کی جائے کہ اگلے مرحلے کے لئے جب یہ سلمان طلبہ دوسرے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جائیں تب بھی ان کی بنیاد ایمانیات معارفی فطریں نہ ہوں اس طرح کے تا تعلیمی اداروں میں تربیت کا ایک اہم جزو بننا چاہیے کہ طالب علم غیر اسلامی معاشرہ سے سمجھوتہ کرنے پر راضی نہ ہو بلکہ اسے تبدیل کرنے کی جدوجہد کو اپنالاکہ عمل بنائے۔ ان اداروں کے لئے ضرورت و حالات کے لحاظ سے مناسب اور جامع نصاب بنانے اور ان کے قیام کے لئے وسائل فراہم کرنے کے لئے مسلمانوں کے اہل علم و اہل خیر کو اپنے رسائل مجتمع کرنا ہوں گے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے مسلمان رہنے کی اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں۔

۲۔ ریاست ادارے قائم کرنے کی اجازت نہ دے تب بھی مسلمانوں پر سے یہ فرض ساقط نہیں ہو جاتا۔ مسلمانوں کی بقا کا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ ان کی نئی پود کا دل و دماغ اسلام پر مٹھیں اور راضی ہو۔ ہماری تاریخ میں ایسی درخشاں مثالوں کی کمی نہیں کہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی مسلمانوں نے علم کے چراغ روشن رکھے اور اپنے نوجوانوں کو جذبہ ایمان سے مالا مال رکھا۔ آج کے دور میں ایسی صورت حال پیش آئے تو یہی روایت ہمارے لئے مشعل راہ ہے اس راہ پر چلتے ہوئے یہ لحاظ بھی رکھنا ہو گا کہ یہ علم و ایمان غیر اسلام کے مقابلے میں سر اٹھا کر اور آنکھیں چا کر کے چلنے کے قابل بنائے اور کسی مرغوبیت کے احساس کو پاس بھی نہ پھٹکنے دے۔

اسلامی تعلیم کا وہ دائرہ جو گھر اور والدین سے متعلق ہے ایسی صورت حال میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ جب معاشرہ کا بہاؤ غیر اسلام کی سمت میں ہو، اہل غلامہ کڈ دینے سے خدا اور رسول کا نام بھی کان میں نہ پڑتا ہو، تعلیمی ادارے اسلام کے ذکر سے خالی ہوں تو مسلمان گھرانوں کو اسلامی تعلیم و تربیت کے اہم تربیتی مراکز میں تبدیل ہو جانا چاہیئے۔ ماں باپ بچوں کی محض مادی ضروریات پورا کرنے کے مکلف نہیں ہیں بلکہ ان کے لئے رضائے الہی کی راہ روشن کرنے کے ذمہ دار بھی ہیں۔ یہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ ان کو زندگی کے بارے میں یہ نقطہ نظر دیں کہ انہیں بالآخر ایک دن رب کائنات کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے اور اس میں کامیابی کے لئے رسول کے اسوہ پر عمل ناگزیر ہے۔ اس مقصد کے لئے آج کے دور میں جدید ترین سمعی و بصری آلات ہر گھر میں استعمال کئے جاسکتے ہیں مثلاً ویڈیو وی سی آر، فلم پروجیکٹر۔ اگر ان کے لئے صحیح لوازمہ فراہم ہو تو یہ سب ذرائع جو ذہن انسانی کو متاثر کرنے کے لئے ہیں، مسلمان والدین کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

غرض بدترین حالات میں بھی اسلامی تعلیم ہی اسلام کی بقا، اس کی اشاعت و ترویج اور اس کی
نہنہیبی روایات کی اگلی نسلوں میں منتقلی کی ذمہ دار ہوگی۔

فلسفہ تقسیم



فلسفہ تعلیم کے ضمن میں ہر دور میں مفکرین نے اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو پیدائش کے بعد سے شروع ہو کر زندگی کے آخری لمحہ تک جاری رہتا ہے۔ اس لئے انسانی تاریخ میں اس پر ہر دور میں غور و فکر کیا گیا ہے۔ اس کے لئے اصول و نظریے مرتب کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ ۲۵ صدی قبل انطاٹون کی "The Republic" تیرھویں صدی میں سینٹ تھامس اکیوناس کی Summa Contra Gentiles اور Summa Theologiae سترھویں صدی میں جان لاک کی (1693) Some Thoughts Concerning Education اور (1706) of the Understanding اٹھارویں صدی میں بیکن کی Enle ۱۹ویں صدی میں مارکس کی Das Kipital اور بیسویں صدی کے اوائل میں جان ڈیوی کی متعدد کتابوں اور بی۔ ایف اسکندر کی تفسیفات میں تعلیم کے بارے میں فلسفے اور نظریے پیش کئے گئے ہیں۔ کبھی علم کی بنیاد پر معاشرہ کو حاکم و محکوم میں تقسیم کیا گیا۔ "انطاٹون" کبھی "مذہب و ایمان کو عقل سے برتر قرار دیا گیا" (سینٹ تھامس) کبھی "ریاست اور چرچ کے مقابلے میں فرد کی آزادی کو خصوصی مقام دیا گیا" (لاک) "انسان کو روحانیت، آزادی اور سادگی کا مرتق قرار دیا گیا" (روبو) کبھی "معاشرے کی ضروریات اس حد تک بڑھانی گئیں کہ فرد صرف اس کا کل پزیر ہو کر رہ گیا۔" (مارکس) کبھی "انسان کے اپنے ماحول اور معاشرہ کے تعامل کا فلسفہ پیش کیا گیا" (ڈیوی) اور کبھی "تعلیم پر سائنسی ذرائع سے کنٹرول کے ذریعے مطلوب معاشرہ قائم کرنے کا نظریہ پیش کیا گیا۔" (اسکندر)

تاریخ کتنی ہی صدیوں کا فاصلہ طے کر جائے زمانہ کتنی ہی ترقی کر جائے سائنس و ٹیکنالوجی انسان

کی زندگی کو کتنا ہی تبدیل کیوں نہ کر دے جب تک دنیا قائم ہے اور اس پر انسان کا وجود ہے، جب بھی اس کی تعلیم کے مسئلے پر غور کیا جائے پہلے اس کائنات میں انسان کی حیثیت کا تعین کرنا ناگزیر ہے کہ کہاں سے آیا، کیا اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے، کیا موت کے بعد کوئی زندگی نہیں، اسلامی نظام تعلیم کے حوالے سے اس لئے کسی فلسفیانہ بحث میں پڑے بغیر تصور کائنات اور تصور انسان کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر پیش کیا جا رہا ہے: ان امور کا تعین، ان کے بارے میں حقیقت کی تلاش اور اس پر ایمان اور شرح صدر محض کتابی اور نظری بحث نہیں بلکہ یہی اسلامی فلسفہ تعلیم کی حقیقی بنیاد ہیں اور انہی کی بنیاد پر تعلیم کے مقاصد، نظام تعلیم کی ترجیحات، طریقہ تدریس، نصابیات کی تدوین، وسائل کا تعین غرض تعلیم کی ہر بحث کے بارے میں ایک اسلامی ریاست اور معاشرہ کے پالیسی ساز اداروں کے لئے راہنما اصول طے کئے جانے چاہئیں۔

انسان کی حیثیت — خلیفۃ اللہ فی الارض

۱۔ ”خداوند عالم نے جو ساری کائنات کا خالق و مالک و فرمانروا ہے اپنی بے پایاں مملکت کے اس حصے میں جسے زمین کہتے ہیں انسان کو پیدا کیا، اسے جاننے سوچنے اور سمجھنے کی توفیق دیں۔ بھلائی اور برائی کی تمیز دی، انتخاب اور ارادے کی آزادی دی۔ تصرف کے اختیارات بخشے اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔“

وہو الذی جعلکم خلیفۃ الارض ... الانعام - ۱۶۵

(وہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا۔)

یعنی اسے نیابت الہی کے منصب سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یہ نیابت صرف روحانی نہیں بلکہ اس میں اختیار و اقتدار (تمکن فی الارض) اور عملی قبضہ بھی شامل ہے زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اس کے لئے مستقر کیا گیا ہے اور اسے یہاں ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

دنیا — ایک امتحان گاہ

۲۔ انسان کو یہ بتا دیا گیا ہے کہ اس کے لئے دنیا کی یہ زندگی جس میں اسے امتحانات دے کر بھیجا جا رہا ہے دراصل اس کے لئے امتحان کی مدت ہے۔ وہ چاہے تو خدا کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارے چاہے تو سرے سے خدا کا انکار ہی کر دے۔ پہلی صورت میں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہو گا اور جب انسان خدا کے پاس پلٹ کر جائے گا تو ابدی راحت و مسرت سے ہمکنار ہو گا۔ دوسری صورت میں دنیا میں فساد و بے چینی کا شکار رہے گا اور عالم آخرت میں ابدی رنج و مصیبت کے گڑھے میں پھینک دیا جائے گا۔

راہ عمل — وحی الہی

۳۔ صحیح راستے کی طرف نشاندہی کرنے کے لئے اللہ نے انبیاء مبعوث کیے جو اپنے اپنے دور کے لئے ہدایت لاتے رہے، آج کے دور کے لئے وہی ہدایت حقیقی راہ عمل ہے جو نبی آخر الزمانؐ لے کر آئے ہیں اور خدا کی کتاب اور ان کی سنت کی شکل میں ہماری راہنمائی کے لئے موجود ہے۔

یہ وہ بنیادی حقائق ہیں جن کا علم ہمیں دہا کے ذریعے حاصل ہوا ہے۔ کوئی فلسفہ تعلیم جو ان حقائق سے صرف نظر کرے، انسانوں کے لئے کسی ایسے نظام تعلیم کی بنیاد نہیں بن سکتا جو ان کی قومی و اخروی فلاح کا باعث ہو، انسانی ذہن کتنے ہی تجربات و مشاہدات سے فیضیاب ہوا اگر اسے یہ راہنمائی نصیب نہ ہو تو صراطِ مستقیم نہیں پاسکتا۔ لیکن یہی مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لئے، اس ہدایت کی روشنی میں فلسفہ تعلیم کے بارے میں واضح فکر حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ قرآن کی آیات اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمودات راہ کے نشانات فراہم کرتے ہیں۔ دور رسالت اور دور خلافتِ راشدہ کا نظام تعلیم راہ دکھاتے ہیں اور بعد کے ادوار میں مسلمانوں کے نظام تعلیم سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ بنیادی تعلیمات کی روشنی میں اپنے اپنے دور میں مسلم امت

اپنی تعلیمی ضروریات کس طرح پوری کرتی رہی ہے۔

فلسفہ تعلیم کے موضوع کی حد متعین نہیں کسی بھی تعلیمی مسئلہ پر غور و فکر میں اگر فلسفیانہ انداز کا اطلاق کیا جائے تو یہ فلسفہ تعلیم میں شمار ہوتا ہے۔ ماضی کے مفکرین نے تعلیم پر جو کچھ لکھا ہے وہ سب بھی فلسفہ تعلیم سے متعلق سمجھا جاتا ہے بلکہ اس لحاظ سے تاریخ تعلیم اور فلسفہ تعلیم کے دائرے ایک دوسرے میں داخل ہوتے ہیں۔ مفکرین تعلیم اقدار کے بارے میں خیر و شر کے تین پر بھی اس عنوان کے تحت گفتگو کرتے ہیں۔ علم اور نظریات کا اطلاق بھی فلسفہ تعلیم میں آتا ہے۔ دیگر علوم کو فلسفہ کی عینک سے دیکھنے سے تعلیم سے متعلق مسائل پر غور و فکر کے لئے نقطہ نظر فراہم ہوتا ہے وہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایک تعلیمیافتہ شخص کس طرح کا ہوتا ہے لکھ

اسلامی نظام حیات میں تعلیم کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ اسی لئے شاید ہی کوئی مسلم مفکر ایسا ہو جس نے تعلیم سے متعلق مسائل پر غور و فکر نہ ہو۔ کسی مفکر کی تعلیمات کا جائزہ یا جائے تو تسلیم سے متعلق اس کی منکروا حق ہو جائے گی۔ امام غزالی، ابن خلدون، شاہ ولی اللہ، علامہ اقبال، مولانا مودودی، محمد قطب اور دیگر ائمہ اور مفکرین اسلام نے فلسفہ تعلیم پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ہمارے پیش نظر ان کو نقل کرنا نہیں ہے۔ قرآن و حدیث کی راہنمائی، ان مفکرین کی نگارشات اور دور جدید کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اسلامی فلسفہ تعلیم کے بنیادی پہلوؤں کی طرف اشارہ کریں گے۔

۱۔ اس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر فرد سے خالق نے ازل میں یہ سوال کیا تھا۔ الست

برجکم اور بندے نے جواب دیا تھا کہ بلی۔ اس طرح ہر انسان کی سرشت میں خالق کی ربوبیت کا اعتراف موجود ہے۔ اس بات کو اللہ کے رسولؐ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ہر بچہ مسلمان پیدا ہوتا ہے اور پھر تم اسے نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہو یعنی ہر پیدا ہونے والا اپنے اندر ایک خالق و مالک کا اعتراف لئے ہوئے فطرتِ سلیم پر پیدا ہوتا ہے لیکن وہ کیا بنتا ہے، یہ اس پر منحصر ہے کہ اسے کس طرح کی تعلیم فراہم ہوتی ہے۔ تعلیم کی غایت یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر موجود اس عہد کو تازہ کرے اس پر پڑی ہوئی گرد کو صاف کرے، اسے جلا بخشنے اور انسان کو اس امر پر آمادہ کرے کہ وہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس عہد کے تقاضے پورے

کرے۔

۲۔ تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو انسان کی زندگی کے ہر دور میں جاری رہتا ہے۔ یہ درگاہوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک بچہ پیدا ہونے کے بعد سے ہی سیکھنا شروع کر دیتا ہے اور سیکھنے یا تعلیم حاصل کرنے کا عمل آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔

اطلبوا العلم من المهد الى اللحد (حدیث)

اس ہدایت کے تحت جدید دور کی ہر قسم کی رسمی و غیر رسمی تعلیم آجاتی ہے۔ ایک طرف ابلاغ عامہ کے ذرائع سے دی جانے والی تعلیم معاشرہ کے ہر فرد پر خواد وہ تعلیم یافتہ ہو یا اصطلاحاً غیر تعلیم یافتہ ہو، اثر انداز ہوتی ہے اور دوسری طرف ایک انسان اپنے ماحول میں جس شخص سے جس ادارے، جس شے سے یا جس سائنسی ایجاد سے رابطہ میں آتا ہے، اس سے تعلیم حاصل کرتا ہے۔ تجربات، مشاہدات، سفر سب اس کے لئے ذرائع تعلیم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تعلیم کا رخ متعین کرنے کے لئے اسے اس کا عہد، ازل یا دلائے کے لئے اور مسلمانوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے مسلمان بچہ کے کان میں پیدا ہوتے ہی جو پہلی آواز آتی ہے وہ اللہ کی کبریائی اور محمد کی رسالت کے اقرار کا اعلان کرتی ہے اور اسے صلوٰۃ و فلاح کی طرف بلاتی ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے جس کی تصدیق و تائید جدید تحقیقات سے بھی ہو رہی ہے۔ کہ انسان کے کردار کا ساچنہ عمر کے ابتدائی حصہ میں ہی ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے۔

۳۔ ایک مثالی اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیئے۔ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب العلم فرضینہ علی کل مسلم فرمایا کہ ایک طرف اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کے لئے حصول علم کو لازمی قرار دے دیا ہے اور دوسری طرف اسلامی ریاست کو یہ پالیسی دی ہے کہ وہ ہر شہری کے لئے بلا تفریق جنس ضروری تعلیم کے لئے نہ صرف سہولت فراہم کرے بلکہ اسے لازمی قرار دے۔ اس پر عمل سے مسلمانوں کے کسی موجودہ معاشرہ میں یقیناً انقلاب برپا ہوگا، خیر و برکت کے دروازے کھلیں گے اور تہذیب و ترقی کی راہیں ہموار

ہوں گی۔

۴۔ ایک مسلمان کے لئے ذاتی طور پر اور کسی بھی مسلمان معاشرہ کے لئے اجتماعی طور پر کتاب ہدایت اللہ کی کتاب قرآن کریم ہے۔ اس کے مطابق رویہ اختیار کرنے یا نہ کرنے پر اس کی فلاح و خسران کا مدار ہے۔ اسلامی نظریئے کے تحت تعلیم کے سارے عمل کی غایت ہی یہ ہے کہ انسان کے حصے میں دنیا و آخرت کی نیکیاں آئیں اور اس کا رب اسے یوم آخرت کا میاب قرار دے۔ زندگی کی کسی بھی اور سرگرمی کی طرح، تعلیم کے دائرہ میں، خواہ یہ گھر کا دائرہ ہو، اہل خانہ کا دائرہ ہو، ریاست کی پالیسی کا دائرہ ہو، تعلیم کا ہوں کا دائرہ ہو، رہنمائی اور ہدایت کا سرچشمہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے۔ اسلامی فلسفہ تعلیم کا یہ بنیادی اصول تعلیم کی تمام جزئیات و کلیات پر حاوی ہے۔

گزشتہ ۱۴ سو سال سے مسلم امت اسی کتاب کی راہنمائی میں اپنا سفر طے کر رہی ہے۔ جہاں یہ راہ سے ہٹتی ہے بتانے والے موجود ہوتے ہیں اور یہ خود بھی نتائج جھگھکتی ہے۔ قرآن و سنت سے براہ راست استفادہ، تاریخی لحاظ سے اس کے مطابق یا خلاف عمل کے نتائج سے استنباط اور اس کی بنیاد پر مسلم مفکرین کی تحریرات آج بھی راہنمائی کا کام انجام دیں گی۔ فرد و اجتماع کے حقوق میں توازن کا مسئلہ ہو، دورِ حاضر کے لادینی افکار کے تجزیہ و مقابلہ کا مسئلہ ہو، نئے نصابیات کی تدوین کا مسئلہ ہو، نوجوانوں کے لئے کھیل اور سیر و تفریح کی حد کا معاملہ ہو، نظم و نسق کے اصول طے کرنے ہوں، اساتذہ کے لئے انتخاب کا معیار مقرر کرنا ہو یا ان کا اقتساب کرنا ہو، ہر مسئلہ میں فیصلہ قرآن و سنت سے ہو گا اور معیار وہی سے حاصل کیا جائے گا۔

۵۔ اسلامی فلسفہ تعلیم کا ایک بنیادی اصول قرآن کی اس آیت سے ملتا ہے۔

وَاتَّبِعْ نِهَا أُمَّتَكَ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الدُّنْيَا (التقص - ۷۷)
یعنی خدا نے دارِ آخرت میں تیرے لئے جو کچھ رکھا ہے اسے حاصل کر لے اور دنیا میں اپنا حصہ لینا نہ بھول جا۔ — تعلیم زندگی کی تمام سرگرمیوں سے براہ راست

متعلق ہے۔ درس گاہوں میں حصولِ تعلیم کی کل مدت میں طالب علم کے نکر و عمل کا رخ متعین ہوتا ہے۔ قرآن اس سلسلہ میں واضح رہنمائی دیتا ہے۔ جو ہر فرد کے لئے بھی راہنمائی ہے اور ایک اسلامی ریاست کے لئے ایسی بھی اسلامی معاشرہ کے شہریوں کی تعلیم و تربیت اس طور سے ہونا چاہئے کہ ان کا سطحِ نظر آخرت ہو کہ یہی حقیقی زندگی ہے جو دائمی ہے۔ آخرت کی قدر کو زندگی میں اس حد تک راسخ کر دینا کہ سوچ اور عمل کے مختلف دائروں میں انسان کے پیشِ نظر اخروی زندگی ہو، اسلامی تعلیم کا اولین مقصد کہا جاسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ قرآن اس طرف بھی بجا طور پر متوجہ کرتا ہے اور یہ ہدایت بھی جس طرح فرد کے لئے ہے اسی طرح اسلامی ریاست کے لئے بطور ایک پالیسی کے بھی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اسے حاصل کرنے کے لئے تمام ممکنہ تدابیر اختیار کی جائیں زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اللہ نے ہم انسانوں کے لئے مسخر کیا ہے اور ہمارا دینی فریضہ ہے کہ ہم اس سے استفادہ کریں۔ زمین کے پیٹ میں اور سمندر کی تہوں میں جو خزانے پوشیدہ ہیں اور انسانی ذہن اپنی جولانی سے جن نئے نئے خزانوں تک رسائی حاصل کرتا ہے وہ سب خدا نے ہم انسانوں کے لئے پیدا کئے ہیں۔ اسلامی ریاست میں تعلیم کی ایک ہیج لامحالہ یہ بھی ہوگی کہ زمین و آسمان کے خزانوں سے بیش از بیش فائدہ حاصل کیا جائے۔ یہ استفادہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اشیاء اور قوتوں اور ان کے قوانین تعامل کا علم حاصل کیا جائے۔

۶۔ تعلیمی فلسفہ میں اس نکتہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے کہ فرد اور اجتماع کا تعلق کس نوعیت کا ہے اور طالب علم کی انفرادیت کے ارتقاء کو کیا اہمیت دی جائے۔ اسلام نے انفرادیت اور اجتماعیت میں ایک حین توازن پیدا کیا۔ ایک تعلیمی فلسفہ میں فرد کی اپنی ذاتی شخصیت کا مناسب ارتقاء اور اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کی بیداری اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے۔

وان ليس الانسان الا ما سعى (النجم-۲۹)

اور یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

افراد مل کر معاشرہ بناتے ہیں، معاشرہ کا افراد کی زندگی میں انتہائی اہم کردار ہے۔ معاشرہ کے افراد پر اور افراد کے معاشرہ پر حقوق ہیں۔ معاشرہ کا اہم ترین ادارہ ریاست ہے اور اس کے بھی حقوق و فرائض متعین ہیں۔ سب ادارے شریعت مطہرہ میں بیان کی گئی حدود کے اندر کام کرتے ہیں اور خدا کی زمین اس کی برکات سے بھر جاتی ہے۔

فلسفہ تعلیم کے ضمن میں بنیادی اسلامی نقطہ نظر درج بالا نکات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ فہ اصول، میں جن کی روشنی میں تعلیم کے مقاصد کا تعین کیا جائے گا۔ نظام تعلیم کی صورت گری ہوگی، ترجیحات کا تعین ہوگا، نصابیات کی تدوین ہوگی، طلبہ اور اساتذہ کے لئے معیار رات طے کئے جائیں گے۔ یعنی اسلامی ریاست کی تعلیمی پالیسی انہی اصولوں کی روشنی میں مرتب کی جائے گی۔

-
- 1- "My Pedagogic Creed" (1897). "How We Think" (1910), "Democracy and Education" (1916) , "Human Nature and Conduct".
 - 2- "Seeing Human Behaviour" (1953) , " Freedom and dignity" (1971) .

۳۔ "تفہیم القرآن" ج ۱، ۱۶، ۱۷۔

- 4- " Encyclopaedia Britannica" vol 6, p.408.

مقامِ تعلیم



اسلامی فلسفہ تعلیم کی روشنی میں تعلیم کے جو مقاصد متعین کئے جاسکتے ہیں ان پر کسی بحث سے پہلے مناسب ہے کہ دورِ جدید کی اس فکر کو زیرِ غور لایا جائے کہ تعلیم کو تہذیبی اقدار اور خیر و شر کے معیار کے بارے میں کسی خاص طرزِ فکر کا حامل نہ ہونا چاہیے۔ طالب علم کو اپنی صلاحیت کے مطابق نشوونما کے لئے پوری آزادی ملنی چاہیے۔

لیکن کیا یہ نظری موقف ممکن العمل بھی ہے؟ کیا یہ عقلاً ممکن ہے کہ انسانوں کا کوئی معاشرہ کسی نہ کسی قسم کے اجتماعی تصورات کے بغیر قائم ہو اور کیا اس معاشرہ میں تعلیم کا عمل ان تصورات سے آزاد ہو سکتا ہے؟ مغربی معاشرے ’لبرلزم‘ کے تصور کے مطابق آزادی کے علمبردار ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ’لبرلزم‘ کے انتہا پسندانہ تصور کے تحت جو تعلیم دی جا رہی ہے کیا وہ بچوں کو ایک خاص طرح کے سانچے میں نہیں ڈھالتی؟ یہ سانچہ مادہ پرستی، افادی اخلاق، حیوانی تقاضا اور زندانِ ثقافت کے اجزاء سے بنتا ہے۔ مغربی تعلیم اپنے طلبہ میں اپنے فکری و ثقافتی تصورات کے لئے بڑا سخت تعصب پیدا کر کے ان کو فارغ کرتی ہے۔

دورِ حاضر سے پہلے بھی دجی الہی کی راہنمائی سے آزاد ہو کر تعلیم کے مقاصد متعین کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ ان کا جائزہ - - - - -

ایک فہرست بنا کر بھی لایا جاسکتا ہے۔ قدیم زمانے سے آج تک اپنے اپنے ادوار میں اپنی اپنی ضروریات اور ذہن کی رسائی کی حد تک مقاصد متعین کرنے کی کوششیں اہل فکر نے کی ہیں۔ لایزالہ ان مقاصد پر اس تہذیب کے مخصوص تصورات کی چھاپ بھی رہی ہے جس کے غلبہ کے دور میں یہ کوشش کی گئی۔ اس باب میں ہمارا موضوع یہ نہیں ہے کہ ہم ان مقاصد کا تاریخی جائزہ لیں بلکہ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ قرآن و سنت کی راہنمائی اسلامی تاریخ میں موجود تعلیمی روایت اور دورِ جدید کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر ایک اسلامی معاشرہ

اور ریاست کے نظامِ تعلیم کیلئے مقاصد کا تعین کریں اور یہ یقین اس لئے کہ انسانیت کی مجموعی فلاح کیلئے قرآن و سنت کی حکومت پر مبنی ریاست و تہذیب ہی عقلاً بہترین ہے۔ ہم اس کی تبلیغ بڑوں میں کرتے ہیں اور بچوں کو اس لئے اس کی تعلیم دیتے ہیں کہ یہ صرف ہمارے لئے بلکہ دنیا بھر کے لئے باعثِ افادیت ہے۔ وہ مقاصد یہ ہو سکتے ہیں:

- ۱۔ حصولِ علم
- ۲۔ تزکیہٴ نفس
- ۳۔ صلاحیتوں کی نشوونما
- ۴۔ ملی ضروریات کی تکمیل
- ۵۔ قومی ضروریات کی تکمیل
- ۶۔ جغرافیائی، علاقائی ضروریات کی تکمیل
- ۷۔ انفرادی ضروریات کی تکمیل

۱۔ حصولِ علم

حصولِ علم اسلامی نظامِ تعلیم کا ایک اہم مقصد ہے۔ اسلامی نقطہٴ نظر سے علم کا سرچشمہ وحی الہی ہے۔ وحی کا آغاز اس دنیا میں مبعوث کئے جانے والے پہلے شخص سے ہوا جسے اللہ نے اپنا نبی بنایا اور علم سے سرفراز فرمایا،

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (البقرہ - ۳۱)

اور (اللہ نے) آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔

اس دنیا میں انسانی زندگی کا آغاز وحی کے حامل ایک انسان کے ذریعے ہذا دراصل اس حقیقت

✽ ”انسان کے علم کی صورت دراصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعے سے اشیاء کے علم کو اپنے فہم کی گرفت میں لاتا ہے۔ لہذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسمائے اشیاء پر مشتمل ہیں۔ آدم کو سارے نام سکھانا گویا ان کو تمام اشیاء کا علم دینا تھا۔“

(تفہیم القرآن (اول) ص ۶۳)

کا اظہار ہے کہ تاریخ انسانی نے سفر کا آغاز علم کی روشنی میں کیا ہے۔ پہلے دن سے انسان کو وہ بنیادی علم عطا کیا گیا جو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے اور راہ ہدایت پر چلنے کے لئے ضروری تھا اور ان ہمتا مسائل کا درست جواب بھی وہ جانتا تھا جن کے حل کے لئے علم وحی کی روشنی سے آنکھیں بند کر کے، آج تک بڑے بڑے فلاسفہ و مفکرین ٹامک ٹوٹیاں مار رہے ہیں۔ انسانی زندگی کے آغاز کا یہ تصور اس تصور سے بدیہی طور پر مختلف ہے جو آج کے جدید ترقی یافتہ دور کا تعلیماتہ اور بزمِ خوشیوں روشن خیال شخص رکھتا ہے۔ ان کے تصورِ علم کے مطابق اولاً تو انسان کا ظہور ہی نظریہ ارتقاء کے تحت بندوں کے آباؤ اجداد کی نسل سے ہوا اور ثانیاً اس کا آغاز تاریکی کے دور سے ہوا جب وہ کچھ نہ جانتا تھا۔ اس نے تجربات و مشاہدات سے علم حاصل کیا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتا آج کے دور تک پہنچا۔ علوم کی تدوین۔ اس کا بنیادی تصور سے جو فرق واقع ہو جاتا ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے *

نظریہ علم کی روایتی بحثوں (Epistemology) سے قطع نظر کرتے ہوئے علم حقیقی کے بارے میں بعض بنیادی نکات اس نقطہ نظر سے پیش کئے جا رہے ہیں کہ ان امور کا منتقل کرنا اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی مقاصد میں ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ ہی علم کا سرچشمہ ہے اور علم کا منبع ہے۔ اس کے سوا اور کسی سے وہ روشنی نہیں مل سکتی جس میں زندگی گزارنے کا راستہ نظر آ سکے۔

وَهُوَ بَکَلِّ شَیْءٍ عِلْمٌ (النور: ۲۹)

انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لئے جو علم اسے درکار ہے اور اپنے اخلاق، تہذیب و معاشرت اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے جن اصولوں کا وہ محتاج ہے ان سب کے لئے اسے صرف اللہ رب العالمین کو اپنا رہنما تسلیم کرنا چاہیئے۔ **

* جدید مفکرین کا ایک الزام ہے کہ اس تصور کی وجہ سے مسلمانوں میں حصول علم میں کاوش اور ایجاد و کتاب کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور نامعلوم کو معلوم کرنے کا جذبہ بیدار نہیں رہتا۔ اس پر تفصیل آگے آئے گی۔ یہاں آنا عرض کرنا کافی ہو گا کہ اس کی وجہ سے دراصل کاوش و محنت کسی مرکز کے گرد ہونے لگی اور بامقصد ہو جاتی ہے۔ مزید یہ کہ مسلمانوں کی علمی تاریخ اس الزام کے غلط ہونے پر دلیل ہے۔

انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی درکانات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لئے جو علم اسے درکار ہے اور اپنے اخلاق و تہذیب معاشرت اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے جن اصولوں کا وہ محتاج ہے ان سب کے لئے اسے صرف اللہ رب العالمین کو اپنا رہنما تسلیم کرنا چاہیئے ***

۲۔ اس زمین پر جو کچھ پیدا کیا گیا ہے انسانوں ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

هو الذی وخلقکم مافی الارض جمیعاً (البقرہ : ۲۹)

وہی ہے جس نے زمین میں ہم سب کچھ تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔

*** ”دنیا میں انسانوں کے بنائے ہوئے اصولوں اور قوانین کی پیروی و اطاعت بھی کی جاتی ہے۔ یہ رہنا تو ضرور ہیں لیکن فی الواقع رہنائے حق بھی ہیں یا ہو سکتے ہیں؟ کیا ان میں سے کسی کا علم بھی ان تمام حقائق پر حاوی ہے جن کو جاننا انسانی زندگی کے صحیح اصول وضع کرنے کے لئے ضروری ہے؟ کیا ان میں سے کسی کی نظر بھی اس پورے دائرہ پر پھیلتی ہے جس میں انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ کیا ان میں سے کوئی ان کمزوریوں سے، ان تعصبات سے اور ان رجحانات و میلانات سے بالاتر ہے جو انسانی معاشرہ کے لئے منصفانہ قوانین بنانے میں مانع ہوتے ہیں۔ جب ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دیا جاسکتا تو آخر یہ لوگ ہدایت حق کا سرچشمہ کیسے ہو سکتے ہیں؟“ (تفہیم القرآن، جلد دوم صفحہ ۲۵)

*** ”دنیا کی اصطلاحوں میں ایسے لوگ علامہ دھر اور علوم فنون کے استاد الاساتذہ ہی کہیں نہ ہوں، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی جگہ پھنسا ہوا ہو جہاں مکمل تاریکی ہو روشنی کی ایک کرن تک نہ پہنچ سکتی ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایٹم بم یا میٹرورجن بم اور آواز سے تیز رفتار طیارے اور چاند تک پہنچنے والی ہوائیاں بنانے کا علم ہے۔ ان کے نزدیک معاشیات، مالیات، قانون اور فلسفے میں مہارت کا نام علم ہے مگر حقیقی علم ایک اور چیز ہے اور اس کی ان کو ہوا تک نہیں لگا ہے۔ اس علم کے اعتبار سے وہ محض جاہل ہیں اور ایک اُن پڑھ دیہاتی ذی علم سے اگر وہ معرفت حق سے بہرہ مند ہے۔“

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۲۱۱)

اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اس کا تفصیل سے علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے لئے انسان کو حواس اور عقل اور دل و دماغ دیئے گئے ہیں۔ اللہ نے تو انہیں کان بھی دیئے ہیں اور دل بھی اور آنکھیں بھی۔ اس نے اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز دینے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے جو حق و باطل کا فرق سمجھنے اور دیکھنے کے لئے ضروری ہو۔ * انسان کا بچہ پیدائش کے وقت جتنا بے بس اور بے خبر ہوتا ہے اتنا کسی جانور کا نہیں ہوتا۔ مگر اللہ کے دیئے ہوئے ذرائع علم سماعت و بینائی اور عقل و تفکر جن کی بدولت وہ ترقی کر کے تمام موجوداتِ ارضی پر حکمرانی کے لائق بن جاتا ہے۔ **

* ”لیکن آج کے دور کے ان محققین اور نام نہاد عالم فاضل حضرات کو کیا کہا جائے جو سب کچھ دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں۔ اپنے اپنے علوم کے ماہر شمار ہوتے ہیں لیکن وہ اس بدیہی حقیقت سے سرف نظر کرتے ہیں کہ دنیا کی کسی شے کو جو بناوٹ، جو شکل و صورت جو قوت و صلاحیت اور جو صفت و خاصیت حاصل ہے اللہ کے عطا کردہ بخشش کی بدولت حاصل ہے۔ ہاتھ کو دنیا میں اپنا کام کرنے کے لئے جس ساخت کی ضرورت تھی وہ اس کو دی اور پاؤں کو جو مناسب ترین ساخت درکار تھی وہ اس کو بخشی۔ انسان حیوان، نباتات، جمادات، ہوا، پانی، روشنی، ہر ایک چیز کو اس نے وہ صورتِ خاص عطا کی جو اسے کائنات میں اپنے حصے کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے لئے مطلوب ہے پھر بنا کر یونہی نہیں چھوڑ دیا ہر ایک کی اس کے کام کے لئے رہنمائی بھی کی ہے۔ کان کو سننا اور آنکھ کو دیکھنا، اس نے سکھایا ہے۔ پھلی کو تیزنا اور چڑیا کو اڑنا اس کی تعلیم سے آیا ہے۔ درخت کو پھل پھول دینے اور زمین کو نباتات اگانے کی ہدایت اس نے دی۔ تفہیم القرآن سورہ صافات) ** ”حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز بجائے خود محض ایک چیز ہی نہیں ہے بلکہ ایک نشانی بھی ہے یہ حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو لوگ ان چیزوں کو محض چیز ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں وہ انسان کا سا دیکھنا نہیں، بلکہ جانوروں کا سا دیکھنا دیکھتے ہیں، درخت کو درخت، پہاڑ کو پہاڑ اور پانی کو پانی تو جانور بھی دیکھتا ہے اور اپنی اپنی ضرورت کے لحاظ سے ان چیزوں کا معرف بھی جانتا ہے۔ مگر جس مقصد کے لئے انسان کو حواس کے ساتھ سوچنے والا دماغ بھی دیا گیا ہے وہ صرف اس حد تک نہیں ہے کہ آدمی ان چیزوں کو دیکھے ان کا معرف اور استعمال معلوم کرے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ انسان حقیقت کی جستجو کرے اور ان نشانیوں کے ذریعے اس کا سراغ لگائے۔“ (تفہیم القرآن دوم۔ صفحہ ۴۲۶)

۲۔ علم کا ایک اہم پہلو خیر و فلاح انسانیت ہے

مغربی حکما بڑے زمانے تک یہی باور کرتے رہے کہ انسانی علوم کے بارے میں اسلام کا رویہ نظری اور داخلی ہے یعنی علمی و تجربی نہیں ہے لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ معرفت ذات اور صفات باری کا علم حقیقی ہونا اپنی جگہ مسلم ہے لیکن قرآنی آیات اور رسول خدا کے فرمودات اس بارے میں بالکل واضح ہیں کہ نقطہ نظر درست کر لینے کے بعد کائنات کی تسخیر اور خدا نے جو کچھ زمین و آسمان کے درمیان پیدا کیا ہوا ہے اس سے بہتر سے بہتر انداز سے مستفاد ہونے اور اس کیلئے طریقے اختیار کرنا مطلوب و مقصود ہے لیکن اس کی اساسیات محض مادی نہیں مغرب کے فلسفہ علمیت یا Pragmatism کے برعکس اس میں مادی اور ایسی جہانی نتائج کے علاوہ روحانی نفع اور آخرت کی خبر بھی شامل ہے۔ تہ فلاح و خیر انسانی کا اسلامی تصور لامحالہ آج کے دور کے پس منظر میں ایک وسیع تصور ہے جو فرد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ سڑکوں، مکانوں اور ہسپتالوں کی تعمیر، علاج کی ضروریات، کھیتی باڑی اور ہر طرح کی ضروریات کے لئے صنعت اور ٹیکنالوجی اور ان سب کے لئے تعلیم و تربیت کا انتظام اس کے دائرہ میں آتا ہے۔

درج بالا گذارشات کی روشنی میں کائنات کا علم حاصل کرنے کا وہ بنیادی نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے جو انسانوں کو پیدا کرنے والے نے اپنی کتاب ہدایت میں بیان کیا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم کی مقصود سازی میں اس انداز کی علمی موشگافیوں کا کوئی وزن نہ ہو گا جو تعلیم کو غیر جانبدار قرار دیتی ہیں۔ صدیوں کے زوال کے نتیجے میں ہماری درس گاہوں میں مختلف علوم کی تدریس میں یہ حقیقی اسلامی نقطہ نظر کتنا ہی اجنبی کیوں نہ ہو گیا ہو، اسلامی نظام تعلیم کی صورت گری جب بھی کی جائے گی اس کی روح یہی فکر قرآنی ہوگی۔

۲۔ تزکیہ نفس

اسلامی تصورات میں حصول علم تربیت سے علاوہ نہیں۔ دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے۔ علم ایمان کی بنیاد ہے اور ایمان تربیت کی اساس۔ یہ بھی دور جدید کا ایک تحفہ ہے کہ علم کے سیرت و کردار سے تعلق کو توڑ دیا گیا ہے۔ علم مجرّد اور محض علم ہوتا ہے جس کا ذاتی زندگی اور سیرت و کردار سے تعلق فوری

ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اس طرح کے نظام تعلیم سے ایک تعلیم یافتہ بے کردار نسل تیار ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے مسلم ممالک میں بھی عملی صورت حال یہی ہے۔ بے خدا تہذیب کے غلبہ اور دوسری غلامی کے اثرات کے تحت ذہن اس حقیقت کو قبول نہیں کرتے کہ نظام تعلیم کی جس طرح یہ ذمہ داری ہے کہ افراد کو علم و ہنر سکھائے اسی طرح یہ ذمہ داری بھی ہے کہ ان کے سیرت و کردار کو اسلام کے مطلوب سانچہ میں ڈھالے۔

تعمیر سیرت اور تربیت کے لئے قرآنی اصطلاح تزکیہ نفس کی ہے۔ تزکیہ کے معنی میں پاک کرنا، اچھا کرنا، نشوونما دینا، ستلے دینا معنی میں اس کا مطلب زندگی سنوارنا ہے اور زندگی سنوارنے میں خیالات، اخلاق، عادات، معاشرت، تمدن، سیاست غرض ہر چیز کو سنوارنا شامل ہے۔

زندگی سنوارنے میں اصل اساس انسان کے اپنے نفس کی کیفیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ نفس انسانی میں تقویٰ اور فحور دونوں کے لئے میلانات رکھنے لگتے ہیں۔

فَالْهَمُّ فَجُورٌ هَا وَتَقْوَاهَا (الشمس - ۸)

تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ فحور کے میلانات کو کمزور دے اور تقویٰ کے میلانات کو اتنا طاقتور کر دے کہ انسانی سیرت کی پوری اٹھان اس کی راہنمائی میں ہو۔ تزکیہ نفس کو کسی نظام تعلیم میں بطور مقصد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اصل حقیقت کا واضح شعور تعلیم کے ذمہ داروں کی ہر سطح پر موجود ہو۔ تب ہی یہ ممکن ہے کہ اسلامی حکومت کی پالیسی کی تشکیل اور اس کے نفاذ میں اسے قرار داتی اہمیت دی جا سکے۔ یہ ایک خالص اسلامی تصور ہے جو آج کل کی جدید فکر کے لئے جس میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا، ایک انقلابی تصور ہے۔

نفس انسانی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ انسانی وجود کی تین حیثیتیں ہیں۔ ایک اس کا اخلاقی وجود ہے، دوسرا اس کا عقلی وجود ہے اور تیسرا اس کا

* اخلاقی وجود کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس الہی طور پر عطا کیا ہے۔ یہ امتیاز و احساس ایک عالمگیر حقیقت ہے جس کی بنا پر دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر و شر کے تصورات سے خالی نہیں رہا ہے۔ اس چیز کا ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر مرحلہ تہذیب و تمدن میں پایا جانا اس کے فطری ہونے کا مرتبہ ثبوت ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت بھی

جوانی وجود ہے ❖❖

نفسِ انسانی کی ایک سرگودہ نوعیت کے پس منظر میں تزکیہ نفس کے اس کام کو سمجھا جاسکتا ہے جو اس امت کے معلمِ اولیٰ نے تعادلاتِ آیاتِ تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ انجام دیا اور جو آج بھی مسلمانوں کے کسی اور تعلیم میں اپنا مقام رکھے گا۔ نفسِ انسانی کا ایسا تزکیہ تعلیم کا مقصد قرار پائے گا جو انسان کو اس دنیا میں اس کی اصل حقیقت سے اس طور پر آگاہ کرے وہ خالق سے بغاوت نہ کرے بلکہ اس کی ہدایت کا دلجمعی سے اتباع کرے۔ حیوانی وجود کی حیثیت سے وہ خواہشاتِ ضرور پوری کرے لیکن تبدیل کے ساتھ ان حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے جو خالق کائنات نے عائد کی ہیں۔

اور یہ تب ہی ممکن ہوگا کہ شریعت کے بتائے ہوئے طریقوں کو اختیار کر کے انسان اپنے ارادہ و اختیار کی اور اپنی اخلاقی حس کی ایسی تربیت کرے کہ صراطِ مستقیم سے نہ بھٹکے اور نظامِ تعلیم ایسے ذرائع و

ہے کہ ایک خالقِ حکیم و دانہ نے اسے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ (تفہیم القرآن جلد ششم ۳۵۳)

❖❖ یہ بھی اس دنیا کی ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ذی عقل و ذی شعور ہستی کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اس کے اندر اپنی روح چھونکی ہے۔

روح وہ خاص جوہر ہے جو فکر و شعور اور عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے جس کی بدولت انسان دوسری تمام مخلوقاتِ ارضی سے ممتاز ایک صاحبِ شخصیت ہستی، صاحبِ انانیت اور حاملِ خداوندی ہستی بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر علم، فکر و شعور، ارادہ، فیصلہ، اختیار اور ایسے ہی دوسرے اوصاف پیدا کئے ہیں۔ یہ اللہ کی صفات کا پر تو ہیں۔ ان کا سرچشمہ مادے کی کوئی ترکیب نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ کے علم سے اس کو علم ملا ہے، اللہ کی حکمت سے اس کو دانائی ملی ہے، اللہ کے اختیار سے اس کو اختیار ملا ہے۔ یہ اوصاف کسی بے علم، بے دانش اور بے اختیار کا خد سے انسان کے اندر نہیں آئے ہیں (تفہیم القرآن جلد چہارم ص ۴۱)

❖❖ حیوانی وجود کی حیثیت سے انسان کی ضروریات اور خواہشات ہیں۔ بطن و فرج کے مطالبات ہیں۔ اس دنیا میں اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے ان خواہشات و مطالبات کی تکمیل ناگزیر ہے۔

وسائل فراہم کرے گا تا کہ ایک مسلمان کی خصوصاً اس کی ابتدائی اور نوجوانی کی عمر میں یہ مطلوبہ تربیت ہو سکے اور اس کی سیرت و کردار کے لئے وہ بنیاد فراہم ہو جو بقیہ ساری عمر اس کی راہنما ہو۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ تزکیہ کے مفہوم میں کسی بھی طرح رہبانیت یا ترک دنیا شامل نہیں ہے بلکہ تزکیہ کا تو مطلب ہی زندگی کو اس دنیا میں رہتے ہوئے، اس دنیا کی تمام چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے خیر و شر کی کشمکش سے گذرتے ہوئے اور شیطان کی پیش کردہ کشش کا مقابلہ کرتے ہوئے سنوار کر گزارنا ہے۔ تزکیہ نفس کو تعلیم کا مقصد قرار دینے سے پورے نظام تعلیم پر اس کے ہر گوشہ پر اثر پڑے گا اور اس کے متعدد مثبت اور منفی عملی تقاضے ہوں گے جو کسی بھی ملک کے اسلامی نظام تعلیم کی منصوبہ بندی میں پیش نظر رکھے جائیں گے۔

اس مقصد کا حصول ایک جدید نظام تعلیم میں کس طرح ممکن بنایا جائے؟ اس کے لئے دورِ حاضر کے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے، قرآن و سنت اور مسلمانوں کی تعلیمی روایت سے راہنمائی حاصل کرنا چاہیئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فریضہ کی تکمیل کے لئے جو طریقہ اختیار کیا اور جو ہدایات دیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ بعد کے ادوار میں مسلمانوں کی تعلیمی روایت میں اس کو ہمیشہ ایک اہم مقام دیا گیا ہے اور مسلم کے کردار، نصاب کی تدوین، طریق تدریس، طالب علم کے مشاغل و معلومات غرض ہر چیز میں اس کی جھلک ملتی ہے۔ یہی وہ روایات ہیں جو آج کے دور میں ہمارے لئے نشاناتِ راہ ثابت ہوں گی۔

۳۔ صلاحیتوں کی نشوونما

اس صفحہٴ رضی پر انسان اللہ تعالیٰ کی وہ شاہکار مخلوق ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ اس نے اسے احسن تقویم پر پیدا کیا، اور ایسی ہی صلاحیتوں سے مالا مال کیا کہ خود انسان اپنے کارنامے دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے (حتیٰ کہ سرکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور بندگی رب سے منہ موڑنے پر اتر آتا ہے!) ہر انسان میں خواہ وہ مرد ہو یا عورت، صلاحیتوں کے ایسے ایسے خزانے ودیعت کئے گئے ہیں جن سے وہ خود بھی آگاہ نہیں ہوتا ہے۔ آج ہمارے چاروں طرف دنیا میں جو بولمونی اور رنگارنگی ہے اور انسانی تاریخ سے ماضی میں جن کارناموں کا پتہ چلتا ہے وہ سب انسان کی صلاحیتوں کا پرتو ہی تو ہیں۔

تعلیم کا یہ مقصد تسلیم شدہ ہے کہ اس کے ذریعے ایک فرد کی صلاحیتوں کو نشوونما ملے۔ اسلامی تعلیم

کا بھی یہ مقصد ہے لیکن اس نظام میں محض صلاحیتوں کا نشوونما مقصود نہیں، بلکہ صلاحیتوں کی صحیح رخ پر نشوونما مطلوب ہے۔ اور اس صحیح رخ کا تعین اس کائنات میں انسان کے حقیقی مقام کی بنیاد پر ہوتا ہے جو اسلامی فلسفہ تعلیم کا اولین نکتہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا :

وَجَعَلْ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (السجہ ۹۱)

(اور تم کو کان دیئے اور آنکھیں دیں اور دل دیئے۔)

”کان اور آنکھوں سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ حصول علم کے ذرائع ذائقہ، لامر اور شامہ بھی ہیں لیکن سماعت و بینائی دوسرے تمام حواس سے زیادہ بڑے اور اہم ذرائع ہیں۔ اسی لئے قرآن جگہ جگہ ان کو خدا کے نمایاں عطیوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ”ان حواس کی حیثیت انسان کے لئے ان بنیادی آلات کی ہے جن کی مدد سے وہ اپنی زندگی گزارنے کے قابل ہوتا ہے اور اس کی تمام صلاحیتوں کی کارفرمائی کا انحصار انہی حواس پر ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا احساس کہ یہ اس کے عطیات ہیں، ایک مسلمان میں جذبہ شکر پیدا کرتے ہیں، وہی تعلیم کامیاب ہے جو بندہ کو ان عطیات کا بھرپور استعمال سکھائے اور احساس شکر پیدا کرے۔

”دل سے مراد وہ ذہن ہے جو حواس کے ذریعے سے حاصل شدہ معلومات کو مرتب کر کے ان سے نتائج نکالتا ہے۔“ انسان میں غور و فکر کی تمام صلاحیتوں کا منبع یہی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے، زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسے سخر کرنے کے رستے سمجھاتی ہے، اسی لئے قرآن نے انسان کی اس صلاحیت کو نشوونما دینے اور جلا دینے پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اگر اس صلاحیت کی صحیح رخ پر نشوونما ہو تو انسان کبھی راہ راست سے نہ ہٹے گا اور تہذیب و ترقی کی منزلیں بھی طے کرے گا اور ایجاد و اکتشافات کے میدان میں بھی کارنامے کرے گا۔

غور و فکر، عقل و تفکر، تدبیر، تجزیہ، استنباط، استقراء، نتائج کی ترتیب ان سبکی حیثیت انسانی صلاحیتوں کی ہے۔ جب کوئی مسلمان طالب علم، اسلامی نظام تعلیم میں زیر تعلیم و تربیت آتا ہے تو توقع کی جاتی ہے کہ پورا نظام اس کی ان صلاحیتوں کی اس طور پر پرورش کرے کہ وہ ذہنی بے راہ روی کا شکار نہ ہو بلکہ

سلامت روی اس کا شعاع بنے۔ اس لئے کہ انہی صلاحیتوں کی صحیح یا غلط رخ پر نشوونما سے عمل کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو دیکھا جاسکتا ہے کہ اس دنیا میں انسان نے جو کچھ کیا ہے یا کرنے کے امکانات رکھتا ہے وہ دراصل اس کی ان صلاحیتوں کی کارفرمائی ہے۔ یہی انسان کو انسان بناتی ہیں اور انسان کی آزمائش یہی ہے کہ وہ اس کی کس پہنچ پر تربیت کرے۔

۲۔ ذہنی صلاحیتوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی صلاحیتوں کی اہمیت بھی کم اہم نہیں ہے۔ متوازن شخصیت کی تعمیر اچھی صحت کے بغیر ممکن نہیں۔ قرآن نے طاوت کو مقابلہ کے لئے منتخب کرنے کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں ان کے بارے میں فرمایا ہے:

وزادہ بسطة فی العلم والحسب (البقرة - ۲۴۷)

اور اس کو دماغی و جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں۔ مومن قوی کو مومن ضعیف سے بہتر بنانے والی حدیث بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اسلامی نظام تعلیم اس پہلو پر بھی قرار داتی توجہ دے گا اور اس کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرے گا۔

۳۔ صلاحیتوں کا پہلو، ان کے اظہار کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بولنا سکھایا (وعلّمہ ایلان -

التوکلّم - ۲) ”بولنا وہ امتیازی وصف ہے جو انسان کو حیوانات اور دوسری ارضی مخلوقات سے میسر کرتا ہے۔ یہ محض قوت گوئیائی نہیں بلکہ اس کے پیچھے عقل و شعور، فہم و ادراک، تمیز و ارادہ اور دوسری ذہنی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں جن کے بغیر انسان کی قوتِ ناطقہ کام نہیں کر سکتی۔ اس لئے بولنا دراصل انسان کے ذی شعور اور ذی اختیار مخلوق ہونے کی صریح علامت ہے۔ اس صلاحیت کی مناسب نشوونما کے لئے راہنما خطوط

نہ صرف آیاتِ قرآنی میں بلکہ بڑی وضاحت سے احادیثِ رسول میں بھی ملتے ہیں صلاحیتوں کے اظہار کا ایک دوسرا طریقہ کھنا ہے۔ (علّم بالقلم - العلق ۴) اور قلم سے سکھایا یعنی ”صرف صاحبِ علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم کے استعمال سے کھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقی اور نسل بعد نسل کے بقا و تحفظ کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا یہ علم نہ دیتا تو اس کی علمی قابلیت ٹھٹھ کر رہ جاتی اور اسے نشوونما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچانے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع بھی نہ ملتا۔“

۴۔ زبان و قلم کے ذریعے علمی صلاحیتوں کے اظہار کے ساتھ ایک پورا میدان ہاتھوں کے ذریعے ہنر سیکھنے اور مہارت حاصل کرنے کا ہے۔ فنی تعلیم کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔ ہاتھ سے کام کرنا مسلمانوں کے لئے اتباعِ رسولؐ کی حیثیت رکھتا ہے۔* معاش کے حصول کا تصور اس کے ساتھ نسبتاً زیادہ وابستہ ہے۔ اس کی اہمیت اور تہدیس بھی محتاج بیان نہیں۔ اسلامی نظامِ تعلیم کو زیرِ تربیت طلبہ و طالبات کی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما کا مقصد حاصل کرنے کے لئے متنوع عملی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ جس انسان کو بھی اس دنیا میں پیدا فرماتا ہے، اس کا جواز اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ خود اس کے اوپر اور اس کے معاشرہ اور اس کے نظامِ تعلیم پر منحصر ہوتا ہے کہ اس کی خداداد صلاحیتیں اتنی صیقل ہو جائیں کہ کسی کو بھی (بشمول خود اس کے) دنیا میں اس کا وجود زائد نہ محسوس ہو۔

صلاحیتوں کی نشوونما اور اظہار کے لئے مکمل مواقع کے ساتھ ساتھ یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اس کا وہ حساب بھی لے گا۔ ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئلاً۔ (نبی اسرائیل: ۳۶)

(یقیناً آنکھ کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہوتی ہے۔)

یہ وہ بنیادی فرق ہے جو اسلامی نظامِ تعلیم میں صلاحیتوں کی نشوونما کے مقصد اور کسی دوسرے نظامِ تعلیم میں اس مقصد کے حصول میں ہے۔ اسی فرق کی وجہ سے صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے عملی تدابیر میں جو فرق واقع ہوگا اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے

۴۔ ملّی ضروریات کی تکمیل

اسلامی نظامِ تعلیم میں خواہ وہ کسی بھی ملک یا جغرافیائی خطے میں رائج ہو، اُمتِ مسلمہ کے ایک فرد کی حیثیت سے مسلمان طلبہ کی ضروریات کی تکمیل کا لحاظ رکھا جانا چاہیئے۔ ہر مسلمان خواہ وہ کسی بھی ملک یا خطہ کا باشندہ ہو، اُمتِ مسلمہ کا ایک جزو ہے، قومیت کے حقیقی اور دسین تصور کے مطابق اس کی قومیت اسلام ہے۔ اس نلفظ منظر سے نظامِ تعلیم پر ملّی ضروریات کی تکمیل بھی لازم آتی ہے۔ اس کے

۵۰ ایک حدیث اس مضمون کی ہے کہ بہترین رزق وہ ہے جو آدمی اپنے ہاتھ کی کمائی سے حاصل کرے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے روزی حاصل کرتے تھے۔

بارے میں چند اہم نکات ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

۱۔ ”تعلیمی ادارے اپنی اولین حیثیت میں تہذیب و ثقافت کی منتقلی کے عامل ہیں۔ اگر تہذیب کو درنہ میں دینے یا دسینے ترک کرنے کے ذرائع نہ ہوں تو ہر سلسلہ تحریک کا از سر نو آغاز کرنا ہوگا۔ ثقافت تسلسل پر منحصر ہے اور تعلیمی ادارے عقائد، اقدار، مہارت اور معلومات کے مجموعہ کو منتقل کر کے یہ تسلسل فراہم کرتے ہیں۔“ ۹

عقائد اور ان کے مطابق تہذیبی اقدار کی منتقلی اسلامی نظام تعلیم کا بالخصوص اولین مقصد ہوگا۔ خیر کی بعض اقدار کا مثلاً بہادر، دیانتداری یا محنت وغیرہ کا تو دنیا کے تمام تعلیمی ادارے پر چار کرتے ہیں۔ مسئلہ اجتماعی زندگی اور ایک فرد کی روزمرہ زندگی کے لئے تہذیبی اقدار کا ہے۔ جو لازماً نظریہ حیات پر مبنی ہونا چاہیے۔ غلامی نظام میں بھی کچھ نہ کچھ نظریاتی اور سیاسی اور معاشرتی اقدار زیر تعلیم نسل کو ضرور منتقل کی جاتی ہیں۔ ایسی بنیادیں جو ہر رنگ اور صورت سے خالی ہونے آج تک دنیا کی کسی درس گاہ میں دی گئی ہے نہ آج دی جا رہی ہے۔ ”لئے تعلیم کلچر کی خادم ہوتی ہے۔ اور کچھ بھی کہا جائے علماً اس کا یہی کردار رہتا ہے۔

تہذیبی اقدار کی منتقلی میں نظام تعلیم کا کردار مثبت بھی ہوگا اور منفی بھی۔ اسلامی تعلیم کے ماہرین نے قرآن و سنت سے استفادہ کرتے ہوئے خیر اور شر کی اقدار پیش کی ہیں، ہمارا مقصد ان کا احاطہ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اس مرحلہ پر صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کا اسلامی تہذیبی اقدار کو منتقل کرنا ملی ضروریات کی تکمیل کی تعریف میں آتا ہے۔

۲۔ آج کے دور میں جب کہ مسلمان ملکوں اور قوموں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہمارے دشمنوں کی صدیوں کی سازشوں کے نتیجے میں امت مسلمہ جاہلی عصیتوں کا شکار ہے اور گروہوں میں تقسیم ہے۔ نظام تعلیم کے اس کردار کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے کہ وہ ہر طالب علم میں امت مسلمہ کا ایک فرزند ہونے کا جیتا جاگتا شعور پیدا کرے جو اس کی فکر اور اس کے عمل میں رہے بس جائے۔ اگر نظام تعلیم طلبہ میں یہ شعور بیدار کرنے میں کامیاب ہو جائے تو امت کے بہت سے بظاہر لایخلاق انفرادی اور اجتماعی مسائل حل ہو جائیں۔ ایک مسلمان کا امت کا ایک جزو ہونے کا تصور قرآن کی آیات اور متعدد احادیث میں ملتا ہے۔

* مثلاً صرف ”جیا“ کی قدر کو لے کر اسلامی نظام تعلیم اور مغربی نظام تعلیم کے ہر پہلو کا تقابل کیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

”مسلمان مسلمان کے لئے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو قوت پہنچاتا ہے۔ پھر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پیوست کر کے بتایا۔“ (حدیث نبوی)

امت مسلمہ کی وحدت کا تصور آج کے خصوصی حالات میں مسلمانوں کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے لیکن عام حالات میں بھی یہ ایک مثبت قدر ہے جس کے حصول کے لئے منصوبہ بندی کی جانا چاہیئے۔ طلبہ کو بلاد اسلامی کی تاریخ اور جغرافیہ کے بارے میں مثبت نقطہ نظر سے معلومات ملنا چاہئیں اور باہمی سفر کے ذریعے فاصلے قرب میں بدلنا چاہئیں۔ یہ نہ صرف اتحاد اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی طاقت و قوت کا سبب ہوگا بلکہ غیر اسلامی نظام اور باطل کے مقابلے میں جہاد کا جذبہ بھی پروان چڑھائے گا اور ریاست کی خارجہ پالیسی پر بھی اثر انداز ہوگا۔

۳۔ امت مسلمہ میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے جہاں مختلف ممالک کے باہمی اختلافات حائل ہیں اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی کم اہم نہیں۔ یہ امت میں اشراق و انتشار کی وہ سطح ہے جس نے مسک اور فرقہ کی بنیاد پر مسلمانوں کو بالکل بھاڑ کر رکھ دیا ہے اور ان کی متحدہ قوت کو رکھنا دیا ہے۔ ایک ملک تو کجا، ایک شہر اور ایک محلہ کے مسلمان بھی قومی مسائل پر دینی نقطہ نظر سے باہم دست و گریبان نظر آتے ہیں۔ اسلامی نظام تعلیم جس کی اساس نقطہ نظر تفصیلات سب کچھ اسلامی نظریہ سے ماخوذ ہے، اتحاد کا ذریعہ بنا چاہیئے اور یہ افسوسناک صورت نہ پیدا ہونا چاہیئے کہ لادینی طرز فکر کو تو سب ٹھنڈے پٹیوں برداشت کریں لیکن دوسرے مسک کا معاملہ آتے ہی میدان میں نکل آئیں۔ نظام تعلیم کو شعوری کوششوں اور اقدامات کے ذریعے نئی نسل اور بالعموم میں دین کی بنیاد پر یکسانی فکر اور ہم آہنگی خیال پیدا کرنا چاہیئے اور فرقوں کے بارے میں ایسا ذہنی و عملی رویہ تشکیل دینا چاہیئے کہ اختلافات اپنے دائرہ میں رہیں اور امت کے متحدہ طاقت بننے کے عمل میں رکاوٹ نہ بنیں۔

۴۔ ملی نقطہ نظر سے معاشرہ کی ضروریات کا ایک دائرہ اس کی دینی راہنمائی اور دینی ضروریات پورا کرنے کا ہے، علماء فقہاء قراء اور ائمہ مساجد کی تعلیم و تربیت اور محلوں میں تدریس قرآن کا نظم مرتب مردوں کے لئے بلکہ ایک دائرہ نہیں میں عورتوں کے لئے بھی اسلامی معاشرہ کی ضرورت ہے جسے نظام تعلیم کو پورا

کرنا چاہیئے۔ تعلیم و تربیت کے اس نظام میں یہ امر خصوصاً ملحوظ رہنا چاہیئے کہ دین کی صحیح تعلیم دی جائے تاکہ دین و دہرہ اتحاد رہے، وجہ انتشار نہیں۔

۵۔ ملی ضروریات کی تکمیل کا ایک پہلو مختلف اسلامی ملکوں کی وہ ضروریات ہیں جو وہ دفاع، معیشت، مالیات، تجارت، زراعت، صنعت، تعلیم، ٹیکنالوجی اور دیگر دائروں میں ایک دوسرے کے تعاون سے پورا کر سکتے ہیں۔ زمین و آسمان کے خزانے اس اُمت کے لئے ہی ہیں بشرطیکہ وہ انہیں حاصل کرے۔ ہماری زمین اندر اور باہر، پہاڑ اور سمندر سب خدا کے انعامات سے بھرے ہوئے ہیں۔ کچھ ظاہر ہو گئے ہیں اور کچھ ابھی منتظر ہیں۔ دوسری طرف انسانی وسائل کا جو سرمایہ ہے وہ بھی اُمت کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ اس سوچ کو سامنے رکھ کر ہر ملک اپنے نظام تعلیم کو اسلامی خطوط پر تشکیل دینے کے لئے اقدامات کرے تو اس کا مقصد یہ بھی ہونا چاہیئے کہ باہمی تعاون سے اپنے وسائل کو مفید ترین معنوں میں لائے۔ اسی طرح اُمت کے اجتماعی مسائل حل ہو سکتے ہیں نظام تعلیم اس نقطہ نظر سے منصوبہ بندی کر کے تعلیم و تربیت کے لئے سہولت فراہم کرنا چاہیئے۔

۵۔ قومی ضروریات کی تکمیل

اسلامی نظام تعلیم جس ملک میں رائج ہو گا اسے اس ملک کی حدود کے اندر رہنے والے تمام باشندوں کی اجتماعی ضروریات اور ملک کی خصوصی صورت حال کے تحت درپیش مسائل سے بحث کرنا چاہیئے۔ قومی ضروریات کا تعین ہر ملک کی اپنی صورت حال میں ہو گا یہاں جو کچھ بھی کہا جا رہا ہے وہ پاکستان کے پس منظر میں ہے لیکن پاکستان جیسے دوسرے تمام مسلمان ممالک پر جو آج کل کی اصطلاح کے مطابق تیسری یا چوتھی دنیا میں آتے ہیں اور جنہوں نے دورِ غلامی گزار کر آزادی حاصل کی ہے، اس کا بڑی حد تک اطلاق ہوتا ہے۔

اسلامی نظام تعلیم کی منصوبہ بندی اس طرح کی جائے کہ وہ ملک و قوم کے درج ذیل تقاضوں کی تکمیل کرے۔

۱۔ قومی وحدت کے عامل کی حیثیت سے

بلاشبہ وحدت کی اصل بنیاد تو اسلامی نظریہ و عقیدہ ہی ہے۔

لیکن متعدد ایسے مظاہر ہیں جن کا ملک کے لحاظ سے فرق ہو سکتا ہے لیکن کسی ایک ملک کی حد تک ان میں وحدت پیدا کر کے ایسا نظام تشکیل دیا جاسکتا ہے کہ فارغ التحصیل فرد قومی شخص کی علامت ہو اور ایک ہی ملک میں طرح طرح کے تعلیمی ادارے بنیادی طور پر مختلف یا ایک دوسرے سے متضاد شخصیتیں تیار نہ کر رہے ہوں۔ چونکہ موجودہ صورتحال میں دورِ غلامی کے ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھنے کی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ربیعِ صدی گزرنے کے باوجود نظامِ تعلیم آزاد اسلامی ذہن سے تشکیل نہیں دیا گیا ہے اس لئے ایک ہی ملک میں کئی کئی طرح کے نظامِ تعلیم اور مختلف بھارے ملتے ہیں۔ نظامِ تعلیم قومی وحدت حاصل کرنے کے لئے جہاں انقلابی انتظامی تبدیلیاں عمل میں لاتے وہاں ان بنیادی امور کی طرف بھی توجہ مبذول کرے۔

الف۔ مشترکہ تاریخی ورثہ اور آزادی کی جدوجہد کی بنیاد پر جو قومی ہیروز ہیں ان کا تعین اور ان کی شخصیت دکا زناموں کی بطورِ خاص تدریس، ان کی پیدائش وغیرہ کے دن منانے کے لئے ثقافتی تقریبات وغیرہ کا انعقاد کیا جائے۔ یہ خیال رکھتے ہوئے کہ ان شخصیات کی ملی حیثیت بھی ہو اور ان کی عظمت ان کی اسلام کی خدمت کے حوالے سے ہو۔

ب۔ ذریعہٴ تعلیم کی حیثیت سے کسی اجنبی یا سابق حاکم کی غیر قومی زبان کے استعمال سے نجات حاصل کرنا اور کیسویہ کہ قومی زبان کو رائج کرنا۔
ج۔ قومی لباس کی ترویج کرنا۔

د۔ انصا بیات اور تعلیم سے متعلق مضموبہ سازی میں قومی اقدار کا لحاظ
ہ۔ اپنی مملکت کے لئے نظریہٴ اسلامی کے حوالے سے مہم مواقع پر ثقافتی تقریبات منعقد کرنا۔

و۔ ایسے تمام عوامل کی تلاش میں دقتِ نظر سے کام لینا اور پھر ان عوامل کو نظامِ تعلیم سے خارج کرنا جو وحدتِ قومی کے خلاف ہوں۔

۲۔ معاشرتی عدل کے وسیلہ کی حیثیت سے۔

اسلامی دنیا کے بیشتر ممالک کا ایک سنگین مسئلہ طبقاتی تفاوت ہے جو بد قسمتی سے سنگین سے

لیکن تربیتا جارا رہا ہے۔ اقتصادی ترقی کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود ترقی کے پھل ایک محدود مراعات یا نفع طبقہ کے حصہ میں آرہے ہیں۔ اس سے اجتماعی زندگی میں جو زہر گھل رہا ہے

اس صورت حال کے علاج کے لئے زندگی کے مختلف میدانوں میں تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں لیکن تعلیم بھی اس میں اسلامی نقطہ نظر سے اہم کردار ادا کر سکتی ہے اور یہ اسے ادا کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اسلامی نظام تعلیم کو قوم کے تمام افراد کے لئے یکساں مواقع فراہم کرنے کے مقصد کے تحت سب کے لئے یکساں نوعیت کے تعلیمی ادارے قائم کرنا چاہیے جہاں مختلف طبقاتی پس منظر سے آنے والے طالب علم یکساں محل میں یکساں معیار کی تعلیم حاصل کریں۔ بلاشبہ قومی ضروریات کے لحاظ سے اداروں میں تنوع ضرور ہوگا لیکن یہ ضروریات کے لحاظ سے ہوگا، طبقات کی بنیاد پر نہیں۔ اسلامی نظام تعلیم کو یہ ضمانت دینا چاہیے کہ ماسوائے صلاحیت کے کسی کو کسی دوسری بنیاد پر معاشرہ میں آگے بڑھنے کے مواقع نہیں ملیں گے۔ نیز نہ تو کسی کے پاس وسائل کی زیادتی بہتر اور اعلیٰ تعلیم کی ضمانت ہوگی اور نہ کسی کے پاس وسائل کی کمی کا ہونا عام تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول تک کسی بھی مرحلہ میں رکاوٹ بن سکے گا۔ یہ بدی کا چکر ہے جس میں کہ عوام ہمیشہ محروم ہی رہتے ہیں اور اچھی خاصی صلاحیتوں کے باوجود بھی محرومی کا چکر توڑنے کے لئے تعلیم کی قوت کو استعمال نہیں کر سکتے اس حالت کے ختم ہونے بغیر کوئی نظام تعلیم اسلامی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نظام تعلیم کی منصوبہ بندی اگر راست فکری سے کی جائے تو اس میں طبقات کو توڑنے کی بڑی امکانی قوت موجود ہے، لیکن اس کا مکمل طور پر نتیجہ خیز ہونا خلوص سے اسے استعمال کرنے کے ساتھ مشروط ہے، محض دکھاوے کے اقدامات سے نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔

ایک اسامعاشرہ جس میں عدل کی کارفرمائی ہو، اسلام کا نصیب الین ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے۔ اس کلیہ کی مدد سے تعلیمی پالیسی کا رخ بھی متعین کیا جاسکتا ہے۔ مزید برآں اگر مسلمانوں کی تعلیمی روایت دیکھی جائے تو ہم ہی دنیا کی وہ قوم ہیں جس نے تمام معاشرے کے لئے یکساں مواقع کا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس پر صدیوں تک عمل بھی کیا۔ مسلمانوں کی تعلیم کے مقاصد میں یکساں تعلیمی مواقع کا تصور اور اس کی عمومی ترویج کا اصول شامل تھا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیمی روایت کی اولین خصوصیت یہ تھی کہ تعلیم کو جمہوری کر دیا گیا تھا۔ مسجد کی طرح مدرسے میں بھی سب برابر ہوتے تھے اور یہ اصول قائم کر دیا گیا تھا کہ عربوں کو بھی تعلیم دی جائے۔

اسلامی دستور کے مطابق تعلیم ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ یہ تصور اور اس کے مطابق عمل کی روایت اسلام کے ماننے والوں نے اس وقت قائم کی جب دنیا اس سے نا آشنا تھی۔ آج کی دنیا کے بعض نطفے محض ردی، پھڑپھڑے اور مکان کو انسان کی بنیادی ضرورت قرار دیتے ہیں جبکہ اسلام تعلیم کو بھی ایک بنیادی ضرورت قرار دیتا ہے اور ریاست پر لازم کرنا ہے کہ وہ ہر شہری کے لئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت بنیادی ضروری تعلیم کی سہولت فراہم کرے اور اس امر کو یقینی بنائے کہ ہر شہری اپنا تعلیم باندھ ضرور ہو کہ اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق بسر کر سکے اور آسائش میں کا یہ باب ہر کے جہالت، اسلام کی جو دراصل خود علم ہے، ضد ہے اور ایک اسلامی معاشرہ اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

موجودہ صورت حال میں مسلم مملکت میں مثالی سرفہر خواندگی کا ہدف بننا ہر خواب و خیال کی بات معلوم ہونا ہے لیکن اسی ہدف کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے اور اس کو وہ اہمیت حقیقتاً دینی بھی چاہیے جو ایک اسلامی ریاست میں مطلوب ہے۔ اگر قومی ترقی پر اخراجات کی ترجیحات کا یقین اسلامی نقطہ نظر سے کیا جائے تو نہ صرف شان و شوکت کے اظہار پر اور دیگر غیر ضروری مدت پر بے شمار اخراجات بچا کر بلکہ بعض کم ضروری مدت سے بھی رقم بچا کر اس قومی ضرورت پر صرف کی جاسکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مسلم معاشرہ کو نہ صرف نئے ٹیکس بخوشی قبول کرنا چاہیے۔ بلکہ مناسب حالات فراہم ہوں تو تعاون کے جذبے کے ساتھ اس کا بار دھکا کا رازہ طور پر اٹھانا چاہیے۔ تعلیم بہترین سرمایہ کاری کا سارہ بھی شمار ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ طب صنعت، زراعت، مہارت، نون وغیرہ تمام پہلوؤں سے معاشرہ کے لئے مفید نتائج کا ذریعہ بنتی ہے۔ بہر حال اسلامی حکومت کو علم کے زرخ کو قومی و دینی ضرورت قرار دے کر اس کے لئے منصوبہ بندی کرنا چاہیے اور اسے اس طرح رو بہ عمل لانا چاہیے کہ اس کے مقاصد اسلامی ریاست کے مقاصد سے اس کا طریق کار اسلامی معاشرہ کی اقدار کی مناسبت سے اور اس کا نصاب دینی و قومی ضروریات سے مطابقت رکھتا ہو۔ ہر شہری تک علم پہنچا، معمولی کام نہیں اس کے لئے مناسب حکمت عملی بنانا چاہیے اور اس کے لئے عوام کے رجحانات کے لحاظ سے مطالعہ و تحقیق کا انتظام کرنا چاہیے لیکن ایک اسلامی مملکت میں یہ سب کام خصوصی ترجیح و اہمیت سے کیا جائے گا اس لئے کہ حقیقی علم کے عام ہو جانے سے ہی ایک حقیقی اسلامی معاشرہ کی بنیاد پڑے گی۔

اس مرحلہ پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسلامی مملکت اپنے غیر مسلم شہریوں کے لئے تعلیم کا اس طرح انتظام کرے گی کہ انہیں اپنے عقائد و رسوم پر عمل کی آزادی رہے اور انہیں زبردستی اسلام کے دائرہ میں نہ لایا جائے۔ جہاں کسی خاص فرقہ کے اقلیتی طلبہ مناسب تعداد میں ہوں وہاں ان کے بزرگ اپنے خرچ پر ایک مذہبی پیریڈ کے لئے استاد کا انتظام کر سکتے ہیں لیکن اگر کوئی مدعی کتاب استعمال ہو تو وہ منظور شدہ ہو۔ یہ اسلام ہے جو اپنے حلقہ اثر میں رہنے والے غیر مسلموں کو تہذیبی اور معاشرتی آزادی دیتا ہے۔

سالانہ آن کی دنیا میں اقلیتوں کو ملکی تہذیب میں مدغم کرنے کی کوششیں عام ہیں۔

۴۔ تعلیم کا اعلیٰ معیار

معیار کی بلندی کو قومی ضرورت کا مقام دیا جائے اس لئے کہ اس کے بغیر کیسی بھی تعلیم ہو، ناکارہ انسان تیار کرتی ہے۔ اسلامی مملکت کے شہریوں کو نوساری دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا ہے۔ اگر ان کی تعلیم کے معیار بہت ہوں تو وہ دنیا کی امامت و نجات کا منصب جو ان کے لئے ہے، کس طرح حاصل کر سکتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس کو ہدف بنا کر اس کے لئے منصوبہ بندی کی جائے۔ جدید ترین سہولت فراہم کرنے کے لئے جو اخراجات ناگزیر ہیں ان کے لئے وسائل فراہم کئے جائیں، انتظامیہ کو مشائی بنایا جائے، اساتذہ کے انتخاب، نگرانی و احتساب کے نظام کا خیال رکھا جائے، امنیات کا نظام دبانے والا نہ ہوا اور قواعد و ضوابط میں تعلیمی معیار بلند رکھنے کے رجحان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو سب تدابیر سے یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ افرادی طاقت کی ملکی ضروریات کی مطابقت بنیادی

ہر ملک کو اپنے حالات اور پالیسی کے لحاظ سے اجتماعی زندگی کے مختلف دائروں کیلئے تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ہوتی ہے تعلیمی نظام کا مقصد اسلامی ریاست کی پوری مشینری چلانے کے لئے ہر طرح کے رجال کار تیار کرنا ہے لیکن ایسا نظام تعلیم جو خدا ترس اور تربیت یافتہ ماہر ہی پیدا کر رہا ہو لیکن اس کی مطابقت ملک کی ضروریات سے نہ ہو اپنے دیگر مقاصد کے حصول میں ناکام ہو سکتا ہے جدید تحقیقی طریقوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پانچ اور دس سال کے لئے پالیسیوں کا تئین اور ان کی روشنی میں مطلوب افراد کار کی نوعیت اور تعداد کا تخمینہ لگایا جائے اور تعلیمی نظام کو اس طرح تشکیل دیا جائے کہ وہ یہ افراد کار تیار کرے۔

”جدید معاشرہ میں ایسے لائقہ کام ہوتے ہیں جنہیں انجام دینے کے لئے جس تعلیم کی ضرورت

ہوتی ہے اس میں بڑا ترغیب ہے بعض کیلئے ابتدائی اسکول کی تعلیم کافی ہوتی ہے اور بعض کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے

جدید معائنہ میں ان پیشوں کی تعداد تیز سے بڑھ رہی ہے جن کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے..... تعلیم ہی اس پیشہ کی طرف راہنمائی کرتی ہے جو طالب علم کو بڑے ہو کر اختیار کرنا ہوتا ہے..... دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ثانوی تعلیم میں پیشہ درانہ عنصر کی اہمیت بڑھ گئی ہے یہ حکومت کی جانب سے تعلیم کے اخراجات کا اقتصادی فائدہ حاصل کرنے، نوجوانوں کو مفید ملازمت کے لئے تیار کرنے اور صنعتی شعبہ کے لئے ماہر کاربگروں کی بڑھتی ہوئی ضرورت پوری کرنے کی خواہش کا نتیجہ ہے۔“

یہ اقتباس جن حقائق کی طرف توجہ دلاتا ہے وہ لازماً ایک اسلامی حکومت کے منصوبہ سازوں کے پیش نظر رہنا چاہیئے۔

۶۔ جغرافیائی و علاقائی ضروریات کی تکمیل

شاید کوئی ملک بھی ایسا نہ ہو جس کے تمام علاقے جغرافیائی لحاظ سے اس طرح یکساں ہوں کہ وہاں کے رہنے والوں کے رہن سہن، بود و باش، لباس زبان، طور طریقے، رسم و رواج اور ثقافتیں بھی یکساں ہوں۔ اس طرح کی یکسانیت اس فطرت کا تقاضا بھی نہیں جس نے خود پوری کائنات میں رنگ و رنگ بولتھوئیاں بکھیر رکھی ہیں۔ کسی ملک میں رائج اسلامی نظام تعلیم غلامی نہیں، بلکہ اس کے مختلف علاقوں میں مختلف باشندوں کے لئے ہی ہونا ہے اور اسے اس واقعی صورت حال کے ہر اس تقاضے کا خیال رکھنا چاہیئے جو ملک و ملت کے تقاضوں سے ٹکرائے ہو۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے شہوب و قبائل اس لئے بنائے کہ انسان ایک دوسرے کو پہچانے۔ اور ہمیں کسی ایسے نظام تعلیم کو اسلامی نہ کہنا چاہیئے جو اس فرق کو مٹانے کے درپے ہو جائے۔

۱۔ گذشتہ چند صدیوں کے دوران کارفرما عوام کے نتیجے میں آن کے مسلم ممالک میں سے

بیشتر کوہ رہی اور شہری علاقوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے جن کے رہنے والوں کے طرز زندگی میں بڑا فرق واقع ہو گیا ہے۔

۲- مختلف علاقوں کی مختلف رسوں کی وجہ سے عمارات کے نقشوں اور تعمیری کیلنڈر میں فرق ہو سکتا ہے۔

۳- سفنی اور زرعی سربربات کے نقطہ نظر سے مختلف علاقوں میں مختلف نوعیت کے تربیت یافتہ افراد مطلوب ہوں گے۔

۴- مختلف علاقوں کے ایسے رسم و رواج ہو سکتے ہیں جو اسلام سے نہ ملکتے ہوں۔

۵- کسی علاقے میں قومی زبان سے مختلف مادری زبان ہو سکتی ہے۔

ایک اسلامی مملکت کے نظام تعلیم کو ان تمام فطری اختلافات کو ان کا مقام دینا چاہیے اور یہ مقام دنیا اسلامی تصور کے مطابق ایک کارروائی سمجھنا چاہیے اور پالیسی بنانے پر مبنی اور منصوبہ بندی کر کے ہوتے ان کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ رجحانات کے لحاظ کا مطلب یہ نہیں کہ مثلاً کسی علاقے کے لوگ اپنی کم نہی کے باعث یا وہاں کے سربراہ اور لوگ اپنے مفادات کے تحت کسی علاقے میں تعلیمی اداروں کے قیام کی مخالفت کریں تو اسلامی ریاست اس کے آگے سپر انڈاز ہر جائے۔ مملکت کی عمومی پالیسی اپنی مدد میں رہنے والے لوگوں کی بھلائی کیلئے ہے اور یہ ارباب حکومت کا تدبیر ہو گا کہ نوازن و اعتدال اور حکمت سے کام لے۔ غیر ضروری مسائل پر لڑائیاں مول نہ لے اور ضروری مسائل پر بھی لڑائیاں مول لئے بغیر اپنا مقصد حاصل کرے۔

۷- انفرادی ضروریات کی تکمیل

تعلیم کا بنیادی نفع فرد سے ہے۔ افراد میں انسان ہونے کی قدر منترک ہے اور اس لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کی ضروریات اور تقاضے ہیں۔ مگر ذوق و شوق رجحانات اور صلاحیتوں میں اختلاف ہے اور اس حقیقت کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ انسانوں کی ایک تقسیم جنس کے لحاظ سے بھی ہے اور اس طرح عورت اور مرد کے اپنے اپنے طبع و رجحانات اور مرداریاں ہیں۔ افراد ایسے بھی ہیں جو پیدائشی طور پر پاکسی عادتوں کی وجہ سے مند رہیں اور ایسے مند شخص کی تعلیم معاشرہ پر ان کا اثر ہے۔

اسلامی نظام تعلیم کو چاہیے کہ انفرادی ضروریات کی تکمیل کے مقصد کے حصول کے لئے ان امور کا لحاظ رکھے لیکن معاشرے کی اجتماعی ضروریات اور افراد کے رجحانات میں نوازن کو قائم رکھتے ہوئے جب ان

میں تضاد ہو تو یہ بالیسی کا معاملہ بن جائے اور حکومت اس خاص موقع پر ملت کے وسیع تر مفاد میں فیصلہ کرے۔
اس بارے میں بنیادی نکات پیش ہیں:

۱- ایک فرد کی ضرورت میں سرفہرست یہ ہے کہ اسے وسیلہ معاش فراہم ہو۔ جس مرحلہ تک بھی وہ تعلیم حاصل کرے، اس کے نتیجے میں اسے اتنی تربیت اور تہذیب ملنا چاہیے کہ وہ ایک باوقار زندگی گزار سکے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ نظام تعلیم اور ملک کی مجموعی منصوبہ بندی میں ضروری ربط پیدا کیا جائے۔

۲- ایک فرد کو جس حد تک ممکن ہو اپنے ذوق و طبیعت کے مطابق تعلیم و تربیت ملنا چاہیے۔ رجائات کا اندازہ کر لے کے لئے ماہرین نے مختلف طریقے وضع کئے ہیں، ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

۳- اسلامی معاشرہ میں عورت اور مرد کے متعینہ کردار کی بنیاد پر ان کی ضروریات میں اختلاف لازمی ہے مزید برآں ان کی طبائع اور مزاج میں اختلاف بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس لئے تعلیمی منصوبہ بندی میں اس کا لحاظ رکھا جائے اور طالبات کے لئے ان کے مزاج، ضرورت اور قومی و ملکی تقاضوں کے مطابق تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے۔ بنیادی طور پر ان کے لئے گھریلو امور کی مناسب تربیت کا وسیع بیانیہ پر ہر علاقہ میں انتظام ہو۔

۴- معذور افراد بھی معاشرے کا حصہ ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے خصوصی انتظامات کرنا معاشرے کا فرض ہے۔ رسول کو جن کا فرض تعلیم و تہذیب ہے ہدایت دی گئی کہ اندھے شخص پر توجہ دیں۔ اس سے اسلامی ریاست کے لئے یہ اصول فراہم ہوتا ہے کہ معذور افراد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دے۔

نتیجہ:

سطور بالا میں سات عنوانات کے تحت آج کے دور کی ایک اسلامی ریاست کے لئے نظام تعلیم کے

* ابن ام مکتوم کا واقعہ جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۝ اِنْ جَاءَ اِلَّا عَعْلٰی ۝ (سورہ عبس - ۱-۲)

مقاصد متین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کوشش میں رہنمائی قرآن و سنت سے اور مسلم مفکرین کے افکار سے حاصل کی گئی اور جدید دور کے حالات اور تقاضوں پر اس کا اطلاق کیا گیا۔ مسلمانوں کی تاریخی روایت سے بھی یہ اخذ کیا گیا کہ نظام تعلیم ہر دور میں بنیادی اصولوں اور تصورات کی بنیاد پر فرد اور معاشرہ کی ہر طرح کے ضروریات پوری کرتا رہا۔

مقاصد کے حصول کے نقطہ نظر سے اسلامی نظام تعلیم ایک متوازن نظام تعلیم ہو چکا جس میں فرد کی روحانی اور مادی ضروریات کی تکمیل کا مکمل انتظام ہو گا۔ اس دور کی مروجہ اس غلط فکر کی وجہ سے کہ مذہب (اور جزئہ اسلام ایک مذہب ہے اس لئے اسلام بھی) مادی اور اجتماعی زندگی سے بخت نہیں کرتا، اس کے اس پہلو کے بیان میں زیادہ وضاحت سے کام لیا گیا ہے۔ اس موقع پر یہ حوالہ نامناسب نہ ہو گا۔^{۱۴}

”مسلم تعلیم نے مذہبی اور دنیاوی دونوں بنیادی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مذہبی مقاصد میں علم کے سرچشمہ یا بنیاد کی حیثیت سے قرآن کریم کا مطالعہ اور روحانی اور اخلاقی تصورات بشمول بنیادی ایمانیات کا مطالعہ شامل تھا۔ دنیاوی مقاصد میں مذہبی عقیدے اور دنیاوی علم کا امتزاج، یکساں تعلیمی مواقع کا تصور اور اس کا لانچ اور ساتھ ساتھ کایہ مقام شامل تھے کہ وہ راہنما ہیں اور روحی پر مبنی علم یا وجدان کی سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔“

یہی مقالہ نگار اسلامی تعلیم کے عملی مقاصد کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

”مسلمانوں کی دنیاوی تعلیم کے عملی مقاصد اہمیت رکھتے تھے اور دنیاوی بہارت کے اطلاق کی وجہ سے ہی انہوں نے آبپاشی کے نظام، تعمیر عمارات میں جدت طرازی، ٹیکسٹائل، لوہا اور دھات کی مصنوعات، مٹی کی ظروف سازی، چمڑے کی اشیاء، کاغذ اور بارود کی تیاری، تجارت کی ترقی اور تجارتی بحری بیڑہ کے انتظام و انصرام میں ترقی کی منازل طے کیں۔“

مسلم فکر کے مطابق یہ عملی اور افادہ پہلو دینی حیثیت رکھتا ہے۔

مقاصد کا یہ بیان اس طرح کا الگ تھلگ نظری بیان نہیں جس کا تعلق آگے آنے والے پورے خاکے سے نہ ہو بلکہ ان مقاصد کو بیان ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس خاکے کی حدود واضح ہو جائیں تاکہ جب اس خاکے میں رنگ بھرے جائیں تو وہ عدد سے باہر نہ جائیں اور عدد تک ضرور جائیں۔ مقاصد کے بیان کے ذریعہ وہ معیارات فراہم کئے گئے ہیں جن پر اسلامی نظام تعلیم کی کامیابی، کارکردگی یا ناکارکردگی کو

جانچا جائے —

دوسری طرف تعلیمی منصوبہ بندی کے رہنما اسول بھی ہیں ۔۔۔۔۔ ان اصولوں کو سامنے رکھ کر کسی بھی ملک کے حالات میں وہ حکمت عملی اختیار کی جاسکتی ہے جس پر عمل کر کے اس خاکے کو عملی شکل دی جائے۔

ان صفحات میں ایک ماڈل کے طور پر اسلامی نظامِ تعلیم کے خدِ خال واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ پروفیسر سید محمد سلیم " مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ " ص ۶۰۸

۲۔ پنجاب یونیورسٹی " اردو دائرہ معارف اسلامیہ " ج ۱۳ ص ۴۴۸۔

۳۔ " تفہیم القرآن " ج ۶ ص ۱۱۲ اور امین احسن اصلاحی " تزکیہ نفس " ج ۱ ص ۲

۴۔ " تفہیم القرآن " ج ۴ ص ۸۲

۵۔ " تفہیم القرآن " ج ۴ ص ۴۲

۶۔ " تفہیم القرآن " ج ۵ ص

۷۔ " تفہیم القرآن " ج ۵ ص ۱۴۹

۸۔ " تفہیم القرآن " ج ۶ ص ۳۹۶، ۳۹۷۔

9- "Encyclopaedia Britannica" vol 6,p.413.

۱۰۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی " تعلیمات " اور " تصریحات "۔

11- "Encyclopedia Britannica" vol 6,p.332.

12 _____ Ibid _____ p.340.

13 _____ Ibid _____ P.413.

14 _____ Ibid _____ P.414.

عزیز سرمدی تعلیم



تعلیم کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی معاشرہ ایک نظام تشکیل دیتا ہے۔ اس کی ظاہری شکل مختلف ادوار میں اس کے تقاضوں کے مطابق مختلف ہو سکتی ہے کبھی صرف مساجد اور ان کے ساتھ مدارس کا عظیم اشران نظام ایک ترقی یافتہ معاشرہ کی ہر طرح کی ضروریات پوری کرتا تھا یا پھر آج کا دور ہے کہ جب مساجد اور مدارس کچھ خصوصی مقاصد حاصل کر رہے ہیں اور قومی ضروریات پورا کرنے کے لئے اسکول کالج اور جامعات کا نظام قائم ہے۔ اس نظام کا بنیادی عنصر یہ ہے کہ تعلیم دینے والا اور تعلیم پانے والا اسی مقصد سے ایک جگہ جمع ہوں۔ ایک جدید معاشرہ اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے اس کے اداروں کو ہی ذریعہ بنانا ہے۔ اس کے لئے منصوبہ بندی کرتا ہے اور اس پر سرمایہ کاری کرتا ہے۔ جب ہم تعلیمی ادارے کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد اس طرح کے تعلیمی ادارے ہوتے ہیں اور نظام کی بحث بھی عام طور پر ان اداروں تک محدود ہوتی ہے۔ اس تعلیم کو رسمی تعلیم کا عنوان دیا جاتا ہے۔

ان اداروں کی حیثیت جزیروں کی نہیں جو معاشرے سے کٹے ہوئے ہوں اور جہاں دوسرے مقام عوامل کے اثرات سے آزاد ہو کر تعلیم کا عمل جاری رہے۔ یہ ادارے اسی معاشرے میں واقع ہوتے ہیں جہاں تعلیم پانے والے اور تعلیم دینے والے اٹھنے بیٹھنے اور چلتے پھرتے ہوتے ہیں۔ معاشرہ میں چلتے والی تمام رویں ان پر ہر جہت سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لئے معاشرے کے دیگر عوامل کو نظر انداز کر کے محض تعلیمی اداروں کے پس منظر میں جب رسمی تعلیم کی تشکیل نو کی بات ہو تو تعلیم کے ہمہ جہتی و ہمہ گیر عمل کی حد تک یہ ایک ناکمل اور تشنہ بات مرنی ہے۔ ہمارے اس مطالعہ کا موضوع بنیادی طور پر تعلیمی اداروں کے نظام کا اسلامی تصور ہے جس کی تفصیلات آگے آئیں گی لیکن ان کو صحیح پس منظر فراہم کر کے لئے ہم اس باب میں ایک اسلامی معاشرہ میں غیر رسمی تعلیم کو موضوع بنا رہے ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو معاشرے میں تعلیم کا عمل ہر سوسہر ساعت جاری ہے پہلی اذان کی سماعت سے لے کر آخری لمحہ تک زندگی کے ہر دور میں خواہ انسان کہیں ہو کسی حالت میں ہو وہ کچھ نہ کچھ تعلیم پا رہا ہوتا ہے۔ وہ کسی تعلیمی ادارہ کا ایک طالب علم ہو یا نہ ہو وہ طالب علم ہوتا ہے اور معاشرہ معلم سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نیچے میں ایجا رہونے والے نت نئے ذرائع نے معاشرہ کی مسلمانہ اثر انگیزی بھی بڑھادی ہے اور اس کا تصور بھی عالمگیر ہو گیا ہے۔ ہزاروں میل دور ہونے والے واقعات آنِ واحد میں ناظر پیدا کر دیتے ہیں اور کروڑوں انسان بیک وقت تعلیم کے عمل سے گزر جاتے ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی انسان نے کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ لے کر حصولِ علم نہ کیا ہو لیکن اس کی شخصیت نے غیر رسمی تعلیم کے ذریعے مکمل نشو و نما حاصل کیا ہو۔ یہ نوایک انتہائی مثال ہے درنہ یہ عملی صورتِ توسب کے سامنے ہے کہ آخری ڈگری کے حصول کے بعد بھی حصولِ علم کا جو سلسلہ جاری رہتا ہے وہ غیر رسمی ہوتا ہے اور اس ڈگری کے حصول کے دوران بھی محسوس یا غیر محسوس طریقے پر غیر رسمی تعلیم اپنے اثرات ڈالتی ہے۔

غیر رسمی تعلیم کا مطالعہ ورنج ذیل عنوانات کے تحت کیا جاسکتا ہے :

۱۔ گھر

۲۔ ذرائعِ ابلاغ

۳۔ ماحول

۴۔ حکومت

۱۔ گھر

کسی بھی معاشرہ کے نظم میں ناندان یا گھر کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن ایک اسلامی معاشرہ کے نظم میں تو اسے غیر معمولی مقام دیا گیا ہے۔ قرآن کی آیات، رسولِ کریم کی احادیث اور مسلمانوں کی تاریخی روایت سب اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اسلام نے زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس پر عمل میں گھر کو نیسلہ کن اہمیت ہوتی ہے۔ یہ ایک مستحکم ادارہ ہوتا ہے۔ مغربی نظام میں خاندان کی تحلیل ہوتی ہے جس سے زوال آتا ہے۔ اشتراکی نظام تو خاندان کی شکست و ریخت کر ڈالتا ہے۔ لیکن اسلام انسان کی فطرت

کے مطابق اس کو صحیح مقام دے کر معاشروں میں سکون کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ اس ادارہ کو صحیح رُخ پر رکھنے میں بین معاشرتی ادارے اپنا اپنا حصہ ادا کرتے ہیں لیکن والدین کی ذمہ داری نہایت اہم ہے تعلیم کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کسی رسمی تعلیمی ادارے میں داخلے سے پہلے کی عمر کل گھر میں گذرتی ہے اور بچہ سو فیصد والدین کی نگرانی میں ہوتا ہے جدید تحقیقات کے مطابق مستقبل کی زندگی کے بہت سے رویے اسی دور میں تشکیل پا جاتے ہیں۔ اس کے بعد تعلیمی ادارے میں داخلے کے بعد بھی وقت کا بیشتر حصہ گھر میں ہی گذرتا ہے اور اس لحاظ سے گھر کے اثرات سیرت و کردار پر برابر پڑتے ہیں۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے آج کے بچے کل کے والدین ہوں گے اور جو کچھ انہوں نے سیکھا ہوگا اسے آگے منتقل کریں گے۔ اس سیکھنے میں گھر کے علاوہ دوسرے عوامل بھی لا محالہ اپنا حصہ ادا کریں گے لیکن اس سے گھر کے ذریعے ملنے والی تعلیم و تربیت کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

اسلامی احکامات و تدبیرات میں خاندان کے بارے میں بڑی تفصیلات ملتی ہیں خود قرآن نے مرد اور عورت کے فرائض کے دائرہ کار متعین کئے ہیں۔ مردوں کو توام بنایا گیا ہے اور انہیں ایک درجہ زیادہ مقام دیا گیا ہے یعنی مالیات کی فراہمی کی ذمہ داری مرد کے سر ڈالی گئی ہے اور گھر کے امور کی حکومت عورت کے سپرد کی گئی ہے۔

خاندان میں قیادت کا منصب اور فیصلہ کرنے کا مقام مرد کو حاصل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عورتوں یا بچوں کو ان کے حقوق سے محروم کرے۔ مرد پر خاندان کا یہ حق ہے کہ وہ جو کچھ کمائے وہ حلال ذرائع سے حاصل کیا ہو۔ حرام آمدنی سے اسلام میں خاندان کی کفالت کا تصور نہ صرف پورا نہیں ہوتا بلکہ یہ دیگر مقام کو ششوں کے اثرات کو ختم کر دیتی ہے۔ مرد کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو وہ گھر میں عورت کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا جو بڑے ہونے والے بچوں کی ہر مرحلہ پر نگہداشت کرتی ہے ان کی ضروریات پوری کرتی ہے اور ان کی تربیت کرتی ہے۔ اسی لئے ماں کی عظمت و اہمیت قرآن و حدیث میں بار بار بیان ہوئی ہے۔

ماں اور باپ مل کر گھرانہ بناتے ہیں اور یہاں اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ تَعَالَىٰ ۖ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمُ السَّاعَاتِ وَالْجِبَارُوتَ (التحریم: ۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو بجا دے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا

انیدھن انسان اور بھڑہوں گے۔

اور اس طرح مسلمان والدین کے سامنے متضاد متین کر دیا گیا ہے کہ ان کی ساری سرگرمیوں کا مقصد یہی کیا ہونا چاہیے۔ بچوں کی اسلامی تربیت، گھر میں اسلامی روایات کا اہتمام اور خود ایک نمونے کی زندگی گزارنا۔ یہ سب مل کر ہی نار جہنم سے بچاؤ کا سامان فراہم کریں گی۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ ایک ایسے اسلامی گھرانے کے خدوخال کیا ہوتے ہیں جو اسلامی معاشرہ کی اگاتی کی حیثیت سے تعلیم و تربیت کے عمل میں اپنا قرار واقعی منصب ادا کر رہا ہو۔

ہم ایک گھرانے کو اسلامی گھرانہ اس وقت کہہ سکتے ہیں جب اس کا اصل تشخص اسلامی ہو۔ بلاشبہ گھرانہ پر چھاپ اپنے علاقائی ماحول کی بھی ہو ملک و قوم کی بھی ہو اور تہذیب جدید کی نمائندہ عملی ضرورت کی چیزیں بھی موجود ہوں لیکن اگر اس گھر میں اس سطح نظر کو اصل مسئلہ بنایا گیا ہے جس کا ذکر درج بالا آیت میں آیا ہے تو یہ گھرانہ ایک اسلامی گھرانہ ہے۔ اس گھرانہ کے ارکان ماں باپ بچے۔ اپنے کو پہلے مسلمان اور اس کے بعد کچھ اور سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے وجود اور آخرت کی جوابدہی کا احساس ہر شخص کے طرز فکر میں موجود ہوتا ہے اور بچوں کو بھی شروع ہی سے ان تصورات کا احساس دلایا جاتا ہے۔ ایسے گھر میں نماز، روزہ گھر کے روزمرہ پروگرام میں اس طرح شامل ہوتے ہیں جیسے کھانا اور سونا۔ طے جتنے دالے بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اسلامی اقدار کی پیروی کرتے ہیں۔ نشست، برفات، طرز گفتگو، لباس، برتاؤ ہر چیز میں اسلامی اقدار کا خیال رکھا جاتا ہے اور بچوں کو سکھایا بھی جاتا ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء کو ضائع نہیں کیا جاتا بلکہ اللہ کی نعمت تصور کر کے شکر کے جذبات کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ بچے والدین کا احترام کرتے ہیں اور والدین بچوں سے شفقت و محبت کا سلوک کرتے ہیں، اپنے بچے کی انفرادیت کا لحاظ رکھتے ہیں اور جب وہ توجہ کا طالب ہوتا ہے تو اسے جھڑک نہیں دیتے۔ اپنے بچوں کے جذبات و احساسات کا لحاظ رکھتے ہیں ان کی تحقیر نہیں کرتے اور انہیں سخت سزائیں نہیں دیتے۔ ایسے گھرانہ میں اللہ کا نام اکثر لیا جاتا ہے۔ اس کے احکامات کی پیروی کی جاتی ہے، اس کے رسول کی سنت کا اتباع کیا جاتا ہے۔ اسلامی عقائد کا تذکرہ اس یقین و اطمینان سے کیا جاتا ہے جیسے چھوٹے اور بڑے سب کے ایمان تازہ ہوتے رہیں۔ ایسے گھرانے میں انبیاء کے قصے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کی حکایات بچوں کو انتہائی دلچسپ انداز میں سنائی جاتی ہیں۔ والدین کوشش کرتے ہیں کہ اپنے بچوں کو معاشرہ کے مفراثرات سے ممکنہ حد تک بچائیں اور ان کے اندر خود ایسا جذبہ و احساس بیدار کر دیں جو برائیوں کے خلاف دفاع بن جائے۔

اسلامی گھرانہ خوشگوار ماحول رکھنے والا گھرانہ ہوتا ہے۔ یہاں بیچ و پکار نہیں مچی رہتی سب ایک دوسرے سے اچھے موڈ میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس گفتگو کے دوران بہت کچھ سکھا دیا جاتا ہے۔ بیرون قریح کے مواقع استعمال کئے جاتے ہیں۔ نارغ اوقات کو بہترین انداز سے گزارنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

عید الفطر اور عید الفضحیٰ کی تقاریب جوش و خروش سے منائی جاتی ہیں لیکن غیر اسلامی طریقے اختیار نہیں کئے جاتے۔

ایک ایسا مثالی گھرانہ تشکیل دینا آج کے مسلمان والدین کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی بھی اسلامی نظام تعلیم حقیقی برگ و بار نہیں لاسکتا۔ ایسا گھرانہ کس طرح تشکیل دیا جائے؟

اس سلسلے کے کام کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) عمومی امور ۱۔ جسمانی صحت ۲۔ جذباتی صحت

۳۔ ذہنی ارتقار ۴۔ علمی تربیت

۵۔ جمالیاتی ذوق کا نشو و نما

(ب) اسلامی امور ۱۔ حکمت کی تعلیم ۲۔ اسلامی آداب اور پسندیدہ

عادات کی تشکیل

۳۔ فرائض کی ادائیگی ۴۔ نیکی کو پھیلانا اور اسلامی

اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ

۵۔ جہاد کا جذبہ پیدا کرنا اور معاشرے میں بدی کا مقابلہ

۶۔ خواہش نفس کا مقابلہ۔

(الف) عمومی امور

جسمانی صحت ۱

۱۔ ماں کے لئے بچے کو اپنا دودھ پلانا اسلامی طریقہ ہے جس کی حد قرآن نے دو سال مقرر کی ہے۔ رسول اللہ

نے فرمایا کہ ماں بچے کو صرف دودھ ہی نہیں پلاتی بلکہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی دیتی ہے۔ اور یہ حکمت ہے۔ بوتل سے پلانے کے مقابلے میں یہ ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ غذائیت میں، احساس تحفظ فراہم کرنے میں اور ماں اور بچے کے دلوں کی باہمی محبت بڑھانے میں۔

ب۔ صحت بخش اور طیب ہو۔ اللہ خود کہتا ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ (البقرہ ۱۷۲)

(وہ طیب چیزیں کھاؤ جو تمہیں دی ہیں)۔ گھر میں حرام غذا کا گزر نہ ہونا چاہیئے۔ اور غذا حلال آمدنی سے فراہم ہونا چاہیئے۔

ج۔ بچوں کو طہارت کے طریقے آہستہ آہستہ سکھادیئے جائیں۔ پاک اور ناپاک کا تصور انہیں دیا جائے اور پاک کا طریقہ بتایا جائے۔

د۔ کھانے اور سونے کے لئے مقررہ اوقات کی عادت ڈالی جائے۔

ہ۔ والدین بچوں کو ساتھ لے کر باہر سیر و تفریح کے لئے نکلیں، صحت بخش کھیلوں کی تربیت آغاز عمر ہی سے دی جائے۔

و۔ ممکن ہو تو گھر ایسا ہو جس میں ہوا، دھوپ اور روشنی خوب ہو۔

ز۔ نقصان پہنچانے والی اشیاء بچوں کی پہنچ سے دور رکھی جائیں۔

۲۔ جذباتی صحت

اس کے لئے بنیادی اصول یہ ہے کہ بچے کو اپنے ماں باپ کا اور دوسرے بھائی بہنوں کا پیار ملے۔ اسے گھر کے تمام افراد پر مکمل بھروسہ ہو۔ سختی سے مار پٹائی، ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ اور اس کی حقیقی ضروریات کو نظر انداز کرنے سے اس کے اندر اپنے والدین کی محبت پر یا اسے نقصان سے بچانے کی اہلیت پر بد اعتمادی پیدا ہو جائے گی۔ اسلام نے اللہ اور رسول کے بعد ماں باپ کی محبت کو مقام دیا ہے اور ماں باپ کو اولاد سے شفقت و محبت کی تعلیم دی ہے۔ والدین کو چاہیئے کہ بچوں سے اپنی محبت کے اظہار کے طریقے اختیار کریں۔ ان کے بوسے میں انہیں گود میں لیں، ان سے محبت کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ اور پیرائے استعمال کریں۔ اس طرح وہ حقیقی تعلق پیدا ہوگا جو اسلام چاہتا ہے۔

بچوں کے اندر جذباتی لحاظ سے آسودہ اور نفسیاتی لحاظ سے معتدل شخصیت پیدا کرنے کے لئے درج ذیل امور کا خیال رکھا جانا چاہیئے۔

الف - ماں اپنے بچے کو خود دودھ پلائے مگر بچے کی ضرورت مکمل طور پر پوری نہیں ہوتی تب بھی اسے ساتھ ساتھ جاری رکھا جائے۔

ب - بچے کی پیدائش سے لے کر سن بلوغ تک اس کے ساتھ محبت کا علیٰ انہار کیا جائے

ج - بچے کی ذہانت و شخصیت کا احترام۔ ان سے جانوروں کا برتاؤ نہ کیا جائے بلکہ سنجیدہ اور با معنی انداز سے ان سے رابطہ قائم رکھا جائے اور گفتگو، بحث و مباحثہ سوال و جواب کے ذریعے ان کی ذہانت کو برسر کار لایا جائے۔

د - ان پر ظاہر کیا جائے کہ وہ والدین کے لئے پیسے یا اشیاء یا والدین کی اپنی خوشی سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ وہ اپنے کو اپنے گھر میں اجنبی نہ سمجھنے لگیں۔

۳۔ ذہنی ارتقار

کسی بھی اچھے گھرانے میں، بالخصوص مسلمان گھرانے میں، افرادِ خاندان کو باہمی تبادلاً خیال کرنا چاہیئے۔ ضروری کتب بھی موجود ہونا چاہئیں، یہ بچوں کے ذہنی ارتقار میں معاون ہوتی ہیں۔ ہر مسلمان گھرانے میں ایک اچھی خاصی لائبریری ہونا چاہیئے جس میں صرف اسلامی کتب نہ ہوں بلکہ سائنس، ادب اور دوسرے مفید موضوعات پر اچھی اور پُر ندرت کتب اور بچوں کے لئے کہانیاں جمع ہوں۔ ایک ڈکشنری ایک اٹلس اور مختلف موضوعات پر باتھویر کتب لائبریری میں موجود ہوں۔ قرآن، احادیث اور فقہ کی ضروری کتب بھی ہونا چاہئیں۔ اگر والدین کو مطالعہ کا شغف نہ ہو تو شاید بچوں میں بھی یہ شوق پروان نہ چڑھے۔ حصولِ علم مسلمان کا طغرائے امتیاز ہے اور یہ مسلمان گھرانہ ہے جہاں سے اس کا آغاز ہونا چاہیئے۔

الف - والدین کو چاہیئے کہ باتھویر کتابیں بچوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھیں جب تک بچہ پڑھنے کے قابل نہ ہو جائے اسے ان کتابوں میں سے پڑھ کر سنائیں۔

ب - ایسی باتھویر کتابیں اور رسالے ہوں جن کو سامنے رکھ کر والدین سوزج، چاند،

ستارے، پہاڑ، سمندر، جنگلات، دوسرے ممالک اور ان کے شہر، کار، جہاز، ہوائی جہاز
خلائی جہاز، جدید ایجادات، درخت، پھل پھول، غذا انسانی، جسم غرض کہ ہر اس
چیز کے بارے میں جس کو بچہ دیکھتا ہے یا اس کا واسطہ پڑتا ہے گفتگو کریں
اور خدا کی تخلیق و قدرت کی طرف اس سے متوجہ کریں۔ اسے احساس ہو کہ انسان
کے لئے سب کچھ کرنا اس لئے ممکن ہے کہ خدا نے انسان کو صلاحیت دی ہے۔

ج - بچے ہر طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ ان کے تشفی بخش جواب دیئے جائیں۔ ان
کو سوال کرنے پر جھڑک کر حوصلہ شکنی نہ کی جائے۔ جواب نہ آئے تو کسی دوسرے
وقت متوجہ کر کے دیا جائے۔ اگر بچے کو سوالات کرنے سے روکا جائے تو یہ اس
کے ذہنی ارتقار کو روکنے کا اور حصول علم کے شوق کو کم کرنے کا باعث ہوگا اور
بعد میں کلاس روم میں بھی وہ استاد سے سوالات کرنے یا جواب دینے سے
ہچکچاتا رہے گا اور اس طرح حصول علم میں مستقل رکاوٹ رہے گی۔

د - بچوں کو زبان کا صحیح استعمال سکھایا جائے اور الفاظ کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ
استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا
(الرحمن ۳-۴) اور اسے قلم سے سکھایا (العلق ۹) بولنے اور لکھنے میں عمدہ
پیرائے اظہار ایک اسلامی قدر ہے اور نہایت اہم ہے۔ ان سے پوچھیں کہ انہوں
نے کون سی کہانی سنی ہے۔ ان سے پوچھیں کہ انہوں نے دن بھر کیا
کیا ہے۔

ہ - ۴ سال کی عمر سے انہیں پڑھنا لکھنا سکھانا شروع ہو جانا چاہیئے۔ بچوں کی تعلیم کا
آغاز قرآن سے کیا جائے۔ خواہ روز ایک آیت ہی پڑھی جائے۔ آہستہ آہستہ آیات
کی تعداد بڑھائی جاسکتی ہے۔ اسے معنی اور مفہوم بھی بتائے جائیں۔

و - اس کے کھلونے تخلیقی اور ذہن کی تعمیر کرنے والے ہونا چاہئیں۔ بچوں کو بہت
زیادہ کھلونوں سے لاد دینا بھی مناسب نہیں۔ حسب ضرورت عمر کے مطابق
دیئے جائیں۔ تخلیقی سرگرمیوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ رنگین کاغذ، قینچی،

۴۔ علمی تربیت

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ علمی تربیت کا پورا کام اسکولوں پر چھوڑ دیا گیا ہے اور والدین اس سلسلہ میں اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے۔ ۴/۳ سال کی عمر سے بچے کو کائنات کے بہت سے حقائق کے بارے میں والدین بہت کچھ بتا سکتے ہیں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ والدین خود ان باتوں کا علم رکھتے ہوں۔

۵۔ جمالیاتی حس کی نشوونما

اسلام ذاتی عادات، رہن سہن اور لباس میں صفائی اور حسن کی تعلیم دیتا ہے اس باب میں کئی احادیث نقل کی جاسکتی ہیں۔ مسلم گھرانہ بذاتِ خود صاف ستھرا اور سادہ مگر خوبصورت ہونا چاہیے۔ اس کے اندر کی سجاوٹ اس طرح کی ہو کہ دیکھتے ہی معلوم ہو کہ یہ مسلمان گھرانہ ہے۔ دیواروں پر آویزاں کرنے کے لئے ایسے کتبے لئے جائیں جو اسلامی تہذیب کی عکاسی کریں۔

۱۔ بچوں کو خوبصورت مقامات پر لے جایا جائے اور ان کے حسن کے ذریعہ اللہ کی قدرت کی طرف متوجہ کیا جائے۔

ب۔ اس طرح تلاوتِ قرآن کی سماعت بھی بچے کی جمالیاتی حس میں اضافہ کا باعث ہو سکتی ہے۔

د۔ لباس میں خوش ذوقی کی محنت افزائی کرنا چاہیے۔ بچے والدین کے نمونے سے ہی سیکھتے ہیں۔

* پہلی وحی کے الفاظ میں دو لفظ اقرار اور قلم آئے ہیں۔ اسلام کے ذوق جمالیات نے فنِ قرأت اور فنِ خطاطی میں نادر نمونے پیش کئے ہیں، اسلام کا ذوق جمالیات منفرد نوعیت کا اور فطرتِ سلیم کے مطابق ہے۔

(ب) اسلامی امور

بچے کی بالخصوص قبل اسکول کی مدت میں اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم و تربیت کرتے ہوئے یہ امور ضرور پیش نظر رہنا چاہیے۔

۱۔ کوئی بھی پیدائشی طور پر عالم نہیں ہوتا۔ لیکن ہر ایک علم حاصل کرنے کی کم یا زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔

ب۔ اسلامی تعلیم و تربیت کا مرکز و ثقل یہ ہے کہ بچے کا ذہن کائنات کے اصل حقائق خدا اور اس کی تخلیق کی ہوتی ہر دنیا انسان کا اپنا سفر منزل آخرت تک، وہاں جزا و نازا دوسرے انسانوں سے تعلقات اور ان کے حقوق اور اپنے حقوق سے آشنا ہو جائے۔

ج۔ حصول علم کی اصل قوت محرکہ تجسس کی حس ہے۔ اگر کسی ذہن میں یہ حس بیدار نہیں ہے تو مختلف ذرائع سے اسے بیدار کیا جانا چاہیے۔

د۔ اسلام کو عام معنوں میں مذہب سمجھنا ایک غلط فہمی ہے۔ یہ زندگی کو گزارنے کا ایک مکمل طریقہ ہے۔ ہم خود قرآن اور سنت کے احکامات کے پابند رہ کر زندگی گزاریں گے تو یہ طریقہ ہمارے بچوں میں منتقل ہوگا۔

ہ۔ اسلامی عقائد کے ذریعے ہم سے بیدار عقل حقائق جاننے کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ ہم اپنی عقل سے مادرِ ایکس اعلیٰ تر عقل کے مطابق حقائق جانتے ہیں۔ اس لئے اسلامی تربیت ذہنی عمل نہیں بلکہ ذہن کو اس حقیقت کے لئے بیدار کرنا ہے کہ اسلامی نظام حیات ہی اعلیٰ ترین طریقہ حیات ہے۔

اسلامی امور کے ذیل میں ایک مسلم گھرانے میں درج ذیل سرگرمیاں ہونا چاہیے۔

۱۔ حکمت کی تعلیم جدید ماہرین ”حکمت“ کے صحیح تصور سے آشنا نہیں۔ یہ ایک خالص اسلامی تصور ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک تعلیم حکمت بھی ہے مسلمان والدین (اور اساتذہ) کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کی تعلیم دیں

اس سے مراد ہے اعمال کے حقیقی نتائج کو پیش نظر رکھ کر فیصلے کرنا۔ اس کے لئے معلومات کی ضرورت ہوتی ہے لیکن معلومات ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔

۲۔ اسلامی آداب اور پسندیدہ عادات کی تشکیل

حکمت کی تعلیم ایک مسلمان گھرانے میں ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اگر والدین اسلامی زندگی گزارتے ہیں تو بچے خود بخود ان کے طور طریقے اور رویے اور معیارات اختیار کر لیتے ہیں گے اور والدین کی طرح اپنا شخص اسلام سے پیچنتے ہیں اور نماز، روزہ کی ادائیگی میں والدین کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ اجتماعی سرگرمیوں میں شریک ہوں گے اور معاشرہ کی برائیوں کو ان کی طرح مسترد کرتے ہیں۔ اگر والدین کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو تو بچے کے اندر مناسب شخصیت پرورش پاتی ہے۔ مسلمان کے لئے بہترین راستہ یہی ہے کہ وہ محمد رسول اللہ کی پیروی کرے، ان کی طرح وضو کرے، نماز پڑھے، اسلام علیکم کہے، نئے کام کے آغاز پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کہے، ملاقات پر مسکرائے، دعوت قبول کرے، بیمار کی عیادت کرے، جنازے میں شرکت کرے، گھر کے کام کرے، ساتھیوں کے ساتھ خوش مذاقی کرے، دانت صاف کرے، دایں ہاتھ سے کھانا کھائے اور طہارت کے لئے بایاں استعمال کرے۔ یہ محض ذاتی عادات نہیں بلکہ عمل کرنے کے لئے نمونہ ہے۔

۳۔ فرائض کی ادائیگی

ایسے گھرانے میں جہاں سب نماز ادا کرتے ہوں۔ چھوٹا بچہ بھی نماز میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ بچے کو وضو کرنا سکھایا جائے، وضو ٹوٹنے کے مسائل بتائے جائیں، پٹروں کی پاکی، ناپاکی بتائی جائے۔ ۳ سال کی عمر میں سورہ فاتحہ یاد کروائی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کروائی جائیں۔ یہاں تک کہ ۷ سال کی عمر تک پہنچے۔ پھر وہ پوری نماز عربی میں ادا کر سکے اکثر بچوں کو اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے بار بار بھی متوجہ کرنا پڑتا ہے۔

۴۔ اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ

ایک بچے کی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی بیرون خانہ سرگرمیوں میں بھی اسلام کی جھلک نمایاں ہو۔ محلے میں اس کی دوستوں اور گھروں میں آنے جانے میں معیار ہی ہو چھوٹے بچے مل جل کر ایسے بہت سے کام کر سکتے ہیں جو دینی سرگرمی کے زمرے میں آتے ہوں۔ والدین ان سب سرگرمیوں میں بچوں کی حوصلہ افزائی کریں۔

۵۔ معاشرہ کے بد اثرات کا مقابلہ

ایمان کا یہ تقاضا بھی بچے کے ذہن میں ابتدائی عمر سے ہی آنا چاہیے کہ اسے اسلام کی مخالفت کو ٹھنڈے پٹوں برداشت نہیں کرنا بلکہ اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ جہاں بچے میں بدی اور نیکی کا شعور پیدا کیا جائے وہیں اس میں بدی کو برداشت نہ کرنے اور مٹانے کے لئے کوشش کرنے کا داعیہ بھی بردرس کیا جائے۔

۶۔ خواہش نفس کا مقابلہ

شیطان کا مرغوب حربہ نفس کو ہکانا ہے۔ کامیاب وہی ہے جو نفس کی ان خواہشوں سے بچا رہا جن کی طرف شیطان اکساتا ہے۔ بچوں میں اس طرح کی خواہشات کی مخالفت کا جذبہ بیدار رہنا چاہیے۔

درج بالا صفحات میں اسلامی گھرانے کے خدوخال نسبتاً تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں تاکہ اسلامی معاشرہ میں تعلیم و تربیت کے عمل میں اس کا حقہ واضح ہو کر سامنے آ سکے۔ اسلامی نظام تعلیم میں طلبہ کی تربیت میں والدین کا تعاون حاصل کرنے کے لئے اور گھر کی کوششوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے والدین کی سہولت کی خاطر ضروری لٹریچر اور دیگر مواد کاروانہ کو تیار کیا جانا چاہیے۔

۲۔ ذرائع ابلاغ

ذرائع ابلاغ کے الفاظ سے جو تازہ آج کے دور کے ایک انسان کے ذہن میں آتا ہے وہ وہ

ہیں ہے جو آج سے ۲۰ سال ۱۰۰ سال یا ۵۰۰ سال پہلے کے انسان کے ذہن میں آ سکتا تھا۔ اور وہ ہے جو آج

سے ۲۰۱۰ سال بعد نئی نئی ایجادات سے اس میں مزید تبدیلی آنے کے بعد ہو گا۔ اہرین تقبلیات (Futurologist)

اس بارے میں جو پیش بینی کر رہے ہیں وہ عقل انسانی کو حیران کر دینے والی ہے۔ تصور کیا یہ فرق زمانی ہے لیکن ایک فرق مکانی بھی ہے، آج بھی دنیا کے بے شمار حصے ہیں جہاں کے انسان جدید ذرائع ابلاغ کی کار فرماہیوں سے محروم ہیں اور دیکھ کر مختلف خطوں میں ان کی ترقی کے معیار کے مطابق ایجادات کا ہونا اور وسائل کے مطابق ان کا استعمال ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ ہم پاکستان میں رہ کر جسے جدید معیار سمجھ رہے ہیں وہی یورپ و امریکہ کے کسی حصے میں پسماندہ سمجھا جاتا ہو۔ اگر تجرباًًً ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جائے جہاں کوئی جدید ”ذریعہ ابلاغ“ نہ ہو تو سوچا جاسکتا ہے کہ وہاں کے انسانوں کی زندگی، رہن سہن، طرز معاشرت حتیٰ کہ طرز فکر، رویے اور اقدار تک میں کتنا فرق واقع ہو جائے گا۔

ذرائع ابلاغ کے بارے میں غور کیا جائے تو دو فریق سامنے آتے ہیں۔ ایک وہ جو ابلاغ کو رہا ہے دوسرا وہ جس تک ابلاغ کیا جا رہا ہے۔ مثلاً ہمارے انسان کو زبان دی۔ بیان سکھایا۔ قلم دیا لکھنا سکھایا۔ جسم اور اعضاء دیئے تاکہ اشاروں اور حرکات سے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کی تکمیل کر سکے۔ دوسری طرف اس کو کان دیئے جن سے وہ سنے، آنکھیں دیں جن سے وہ دیکھے اور دیکھے۔ ایک دور تھا کہ انبیاء مصلحین، اساتذہ اور واعظین اور فلسفیوں کے پاس صرف زبان ہی ذریعہ اظہار تھا۔ لیکن اب ٹیکنالوجی کے استعمال نے دنیا ہی بدل ڈالی ہے۔ لائوڈ سپیکر، ریڈیو اور کمپیوٹر کے ذریعے زبان سے نکلا ہوا لفظ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ طباعت کی ایجاد اور اس میں ترقی کے بعد، کتب، اخبارات، رسائل، جرائد، پوسٹر اور اسٹیکرز نے قلم کے ذریعہ ابلاغ کے امکانات کو تقریباًًً لامحدود کر دیا ہے۔ اور اب سبکے بیک وقت استعمال کئے جانے والے ذرائع یعنی قلم، ٹی وی، دی سی آر، دنیا پر بھجائے گئے ہیں اور ذرائع ابلاغ کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ ان کی رسائی کا یہ علم ہے کہ ایک ہی واقعہ پوری دنیا میں کروڑوں انسان خلائی سیاروں کے ذریعے اپنے اپنے گھر میں بیٹھ کر دیکھتے اور سنتے ہیں، خواہ یہ سچ کے مناسک ہوں یا بانسنگ کا مقابلہ۔

یہ جدید ذرائع ابلاغ کلاس روم کی عام تدریس کے مقابلے میں زیادہ مؤثر طور پر کام کرتے ہیں۔ اس لئے کلاس روم میں سمعی و بصری اعانات کی اہمیت محسوس کی جاتی ہے۔ کلاس روم سے باہر قومی دائرہ میں بھی ان کی تاثیر طالب علم کیلئے بڑھتی ہے اور عام شہری کے لئے بھی یہ Action Oriented ہوتے ہیں اور اس

وجہ سے ہر عمر کے انسان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

ایک عام تدریسی عمل کے مقابلے میں جس کا مرکز انسانی ذہن ہوتا ہے یہ ذرائع ذہن کے ساتھ ساتھ جذبات کو اپیل کرنے کی بدرجہ اتم خاصیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کا غلط اور صحیح استعمال دونوں صورتوں میں قومی زندگی میں نافع و مضر ثابت کرتا ہے اور شہریوں کی ذہنی و جذباتی تربیت میں کردار ادا کرتا ہے۔

ایک ایسے جدید اسلامی معاشرہ میں جس کے نظام تعلیم کا خاکہ اس مطالعہ کا موضوع ہے ابلاغ کے جدید ترین ذرائع رائج ہونا چاہیے۔ ان کو رائج کرنا اور ان کا استعمال ممکن بنانا اسلامی حکومت کی پالیسی کا ایک مثبت نکتہ ہے لیکن ان کا معاشرہ میں کیا کردار سہنا چاہیے — ۹

ذرائع ابلاغ جیسا کہ لفظ سے خود ظاہر ہے۔ درحقیقت وہ ذرائع ہیں جنہیں کسی بھی مقصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ جدید ذرائع مغرب کی ایجاد ہیں اور اس نے ہی ان کے استعمال کا آغاز کیا۔ فطری طور پر اس میں ان کے نظریہ زندگی اور ان کی تہذیبی اقدار کی ترجمانی ہوتی اور ان کے ساتھ ایک روایت وابستہ ہو گئی۔ اس دوران مسلم ممالک نے ان ایجادات کے ساتھ ساتھ ان کے استعمال کو بھی مغرب سے اخذ کیا۔ دور غلامی تو مجبوری کا دور تھا لیکن سیاسی آزادی کے بعد بھی مسلم ذہن اتنا آزار یا مسلمان نہ تھا کہ اپنی راہ نکالتا اور ان ذرائع کے استعمال کی بالکل نئی اسلامی روایت ڈال دیتا — کچھ جزوی کوشش کی گئی ہیں لیکن کہیں بھی ایسی جامع اور ہمہ گیر روایت نہیں کہ ہم الفاظ کا سہارا لے کر اسلامی معاشرہ میں ذرائع ابلاغ اور تعلیم کے مسئلہ کو بیان کرنے کے بجائے اس روایت کا حوالہ دے دیتے۔

اگر لفظ ابلاغ کا اسلامی روایت کے تحت مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے انبیاء کے حالات بیان کئے ہیں تو ان میں ہر جگہ نبی نے اپنا منصب ہی بیان کیا ہے کہ میں نے رب کے پیغام کا ابلاغ کر دیا۔

حضرت صلح نے فرمایا یقوم لقد ابلیغتم رسالۃ ربی۔ (الاعراف: ۶۹)

اور حضرت ثعلب نے فرمایا یقوم لئن ابلیغکم رسالت ربی۔ (الاعراف: ۱۹۳)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجتہ الوداع کے موقع پر حاضرین سے بار بار تصدیق کروائی کہ کیا میں نے حق تبلیغ اور آرم دیا اور آخر میں کہا کہ جو لوگ غیر حاضر ہیں انہیں حاضرین ان باتوں کی تبلیغ کر دیں۔ ہماری روایت

میں ابلاغ ایک مقدس مفہوم ہے جو انبیاء کے منصب سے متعلق ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں تقریر و تحریر اور عمل کا ایسا میدان ابھرتا ہے جو نیکی، پاکیزگی، تقدس، احترام اور خیر و فلاح کے تصورات سے معمور ہے اور جو اس تصور سے بالکل متضاد ہے جو ذرائع ابلاغ کے جدید دنیا کے استعمال نے ہمارے ذہنوں میں راسخ کر دیا ہے لیکن اسلامی تصور کو ان محدود معنوں میں سمجھنے کی غلطی نہ کی جائے کہ محض مذہبی احکامات کی تبلیغ اس سے مراد ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں حقیقی اسلامی نقطہ نظر سے ایک کامیاب اور بھرپور زندگی گزارنے کے لئے ان ذرائع کا بھرپور اور بامقصد استعمال کیا جائے۔

مقاصد

درسی کتب میں ذرائع ابلاغ کے تین مقاصد بیان کئے جاتے ہیں۔

۱- تعلیم Education

۲- معلومات Information

۳- تفریح Entertainment

تینوں مقاصد کا اپنا اپنا مقام ہے اور ہر معاشرہ اپنے نظریے اپنی اقدار اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے ان مقاصد کے حصول کی حکمت عملی وضع کرتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کو کبھی ان مقاصد کے حصول میں ذرائع ابلاغ کے تقریباً لامحدود امکانات کو پیش نظر رکھ کر اپنی حکمت عملی وضع کرنا چاہیے۔ اس حکمت عملی میں کسی علاقے کی مسلمان قوم کے حقیقی پس منظر کا لحاظ ناگہر ہے۔

۱- تعلیم

ذرائع ابلاغ کے لئے تعلیم کا میدان بے حد وسیع ہوتا ہے۔ قوم کو دینی اور دنیاوی تعلیم ان ذرائع سے دی جاسکتی ہے۔ اگر قوم کی اکثریت ناخواندہ ہے جیسا کہ اکثر مسلم ممالک میں ہے تو اس اکثریت کی تعلیم کی کمی کو ان ذرائع سے پورا کیا جانا چاہیے۔ جن سے خواندگی کے بغیر بھی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ ملت اور قوم کے لئے اور افراد کی اپنی زندگی کے لئے اہمیت رکھنے والے متعدد امور ایسے ہو سکتے ہیں جن پر ان ذرائع سے تعلیم دی جاسکتی ہے۔ ٹی وی پر نماز سکھانا یا قرآن کی تدریس یا ٹریفک

کے قواعد کی تعلیم اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ اس تعلیم کے دائرہ میں یہ آتا ہے کہ مختلف ایسے ہزاروں فنون سکھائے جائیں جو روزمرہ زندگی میں کام آتے ہیں یا تاریخ کی تعلیم دی جائے تاکہ اجتماعی سوچ میں ہم آہنگی پیدا ہو۔

اس طرح کی عمومی تعلیم کے علاوہ نظام تعلیم کے ایک جزو کی حیثیت سے درسی دائرہ میں بھی ان ذرائع کا اپنا کردار ہے۔ یہ مقررہ نصابات کی تفہیم کے لئے پروگرام تیار کر سکتے ہیں جو طلبہ یا ادارے حسب ضرورت استعمال کر سکیں۔ اب تو ایسی جہات بھی موجود ہیں جو کلاس روم کے بغیر بھی تدریس کا پورا عمل مکمل کر کے سند عطا کر دیتی ہیں۔

۲۔ معلومات

ذرائع ابلاغ کا ایک اہم مقصد معلومات فراہم کرنا ہے۔ معلومات کی فراہمی کسی زاویے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ معلومات کے انتخاب اور پیش کرنے کے انداز میں نقطہ نظر کارفرما ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ اسلامی معاشرہ میں یہ نقطہ مثبت اور تعمیری یعنی اسلامی ہوگا۔ اس سے یہ دو گونہ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

الف۔ افرادی ذہنی صلاحیت اور جذباتی میلانات کے لئے اس نوعیت کی غذا فراہم کرنا کہ ان کی نشوونما ہرادر صحیح خطوط پر ہو۔

ب۔ بحیثیت مجموعی پوری قوم کی ذہنی سطح بلند کرنا، ان کو ملت اسلامیہ اور اپنی قوم اور علاقے کے مسائل سے نہ صرف آگاہ کرنا بلکہ ان پر سوچ بچار کی عادات ڈالنا، اظہار خیال اور گفتگو کے لئے آمادگی پیدا کرنا۔

۳۔ تفریح

ذرائع ابلاغ کا ایک اہم دائرہ تفریح ہے۔ تفریح کسی اسلامی معاشرہ کی ایک مثبت قدر ہے جس کا اپنا دائرہ اور امکانات ہیں (تفریح کے بارے میں تفصیلی بحث ”ہم نصابی سرگرمیاں“ کے زیر عنوان ملاحظہ کیجئے) ذرائع ابلاغ کو خواہ یہ اخبارات ہوں، ریڈیو یا ٹیلی ویژن ان کو اپنی سرگرمیوں میں

اس عنصر کو قرار دینی چاہیے۔ اس کا یہ منفی مقصد نہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کو مصروف رکھا جائے تاکہ وہ قومی مسائل پر نہ سوچیں بلکہ انسان کی سلیم فطرت کے تمام تقاضے پورے کرنے کے لئے ہر طرح کی تفریح فراہم کرنے کے لئے پروگرام وضع کئے جانا چاہیے۔

ان تینوں مقاصد کا وقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ معلومات کی فراہمی اور تفریح کے ذریعے بھی دراصل تعلیم دی جاتی ہے۔ جب انسان کو معلومات فراہم ہو رہی ہوں یا وہ کسی تفریح سے لطف اندوز ہو رہا ہو تو اس کی تعلیم و تربیت کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہی تو اسکول میں داخلہ سے پہلے شروع ہو جاتا ہے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ رسمی تعلیم کے دوران بھی اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ تعلیم اور ابلاغ کا تعلق ہی شاید اس کی وجہ ہے کہ خطبہ حجتہ اور ابلاغ میں جس حدیثِ اکریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابلاغ پر حاضرین سے گواہی لی اور ابلاغ کی تاکید کی اس نے اپنی بعثت بحیثیت معلم بتائی۔ اسی لئے ایک اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست تبلیغ (وسیع مفہوم میں) اور تعلیم کو اپنے فرائض منجبی میں شمار کرتی ہے۔

اصول

آئندہ طور میں ذرائع ابلاغ کے لئے کچھ عمومی اصول بیان کئے جا رہے ہیں جن کے اختیار کرنے سے تعلیم کے مقاصد اور ان ذرائع کے استعمال میں ہم آہنگی پیدا ہوگی جیسا کہ کسی بھی نظریاتی ریاست میں ہونا چاہیے اور یہ نہ ہوگا کہ درس گاہ میں طالب علم کو کچھ بتی دیا جائے اور درس گاہ سے باہر کچھ اور۔۔۔ ذرائع ابلاغ کی پالیسی تعلیم ہی کی طرح کسی بھی نظریاتی یا مخصوص اسلامی مملکت کی اہم ترین پالیسیوں میں سے ہے اور ریاست کے فرضِ مفہمی سے براہِ راست متعلق ہے۔ امت مسلمہ کو مبعوث کرنے کے جو مقاصد بیان کئے گئے ہیں وہ جدید دور کی اسلامی مملکت ذرائع ابلاغ کے زیادہ سے زیادہ ممکنہ استعمال کی مدد سے ہی حاصل کر سکتی ہے۔

۱۔ ذرائع ابلاغ کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا بنیادی فریضہ ادا کرنا چاہیے تاکہ
خیر پھیلے، شر دفع ہو، روشنی پھیلے، اندھیرا دور ہو۔ معروف و منکر بہم اصطلاحات نہیں

مسلمانوں کا اجتماعی نیمر جانا ہے کہ معدود کیا ہے اور منکر کیا ہے؟ — ذرائع ابلاغ کا اپنا عمل اس کے مطابق ہونا چاہیے۔

۲۔ اسلامی معاشرت اور تہذیبی اقدار کو پردان چڑھانا چاہیے — انسانی سرگرمی کے ہر دائرہ میں اس کا اطلاق ہے۔ خبر ہو۔ ادبی شہ پارہ ہو، ڈرامہ ہو، باہمی گفتگو ہو، غرض کوئی پروگرام ہو یا کوئی تحریر و تقریر ہو تہذیبی اثر اس میں منعکس ہوتی ہیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یہ اسلام کے مطابق ہوں۔ اس کا خصوصی ذکر اس لئے ضروری ہے کہ موجودہ صورت حال میں تمام مسلم ممالک میں مغرب کے زیر اثر اس میدان میں ان ذرائع کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ اختلاط مرد و زن کے دائرہ میں اسلامی حود کے اندر رہا جائے گا، انہیں عربی و فحاشی کا آلہ کار نہ ہونا چاہیے۔ *قوله الفاس حنا (البقرہ-۸۳)* (اور یا اے اللہ اس قوم کو فساد سے لے کر) کے ذریعے اظہار کی صلاحیت کو صحیح رخ دیا گیا ہے۔ ہم مادر پدر آزادی کا تصور نہیں رکھتے۔

۳۔ دیانتداری اور بے خونی سے واقعات کی صحیح تصویر کشی کی جانا چاہیے۔ عوام کے مسائل ٹھیک ٹھیک ظاہر کئے جانے چاہیں۔ مختلف مفادات کے زیر اثر خبروں کو توڑ موڑ کر پیش نہ کیا جائے۔ شہادت حق کے جذبے کے ساتھ خبریں اور واقعات ٹھیک ٹھیک پہنچائے جائیں۔

۴۔ مظلوم کی دادرسی ان کا شعار ہونا چاہیے۔

لَا يَجِبُ اللَّهُ الْجَهْدَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مِمَّنْ ظَلَمَ (النساء-۱۲۸)

اللہ برائی کے ذکر کو پسند نہیں کرتا ہے مگر مظلوم کی دادرسی (کیلئے)

۵۔ امت مسلمہ کی فلاح و بہتری سر نہرست ہونا چاہیے۔ فرقہ واریت کی حوصلہ شکنی اور امت کا اتحاد بنیادی نکتہ ہونا چاہیے۔

۶۔ دشمن سے نبو آزمائی کے لئے تیار کرنا چاہیے ہر سطح پر اور ہر دائرہ میں۔ امت میں دشمن کی پہچان اور اس کی کارگزاریوں کے بارے میں بیداری پیدا کرنا چاہیے۔

ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ذرائع ابلاغ عمل کریں تو دراصل اس تعلیمی کوشش میں اپنا حصہ ادا کریں گے جو تعلیمی اداروں میں نئی نسل کو اسلام کا انسان مطلوب بنانے کیلئے کی جارہی ہے۔

ذرائع ابلاغ کے ضمن میں ایک بحث سرکاری اور نجی کی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، رسائل و اخبارات، آڈیو ویڈیو کیٹ سرکاری بھی ہو سکتے ہیں اور نجی بھی یعنی ذرائع ابلاغ اپنے استعمال کے لئے اتنے وسائل کے حلقے ہوتے ہیں کہ نجی دائرہ ان میں آگے نہیں جڑ سکتا۔ سیاسی مصلحت کی وجہ سے بعض حکومتیں ہر ذریعہ ابلاغ کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی ہیں۔ اسلامی معاشرہ کے پیش نظر دراصل مقاصد کا حصول ہے۔ خواہ وہ کسی ادارہ کے ذریعے ہو۔ بلکہ اس کے نزدیک یہ پسندیدہ ہے کہ ہر طرح کی طاقت کو ریاست میں مرکوز کرنے کے بجائے (کہ اس کے اپنے مقاصد ہیں) جس حد تک ممکن ہو اور حصول مقاصد سے ہم آہنگ ہو، یہ ذرائع ریاست کے اپنے قبضے میں نہ ہوں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ اوقات یا دوسرے اداروں کے تحت خدمت ملت کے لئے ریڈیو یا ٹیلی ویژن اسٹیشن قائم کئے جائیں اور ایک جامع قانون یا محکمہ نگران کے ذریعے ان کا انضباط کیا جاسکے۔ کسی طرح کی نگرانی کا نہ ہونا ریاست کے مقاصد کے منافی ہے۔ لیکن افراد اور اداروں کو انہیں مقاصد کے لئے سرگرم نہ ہونے دینا اور روکنا بھی ریاست کے مقاصد کے منافی ہے۔ اس بارے میں اعتدال کی راہ نکالنا چاہیے اور یہ اس لئے ممکن ہے کہ اسلامی معاشرہ میں فرد، ریاست اور اداروں کے لئے حتمی ہدایت ایک ہی ہے اور وہی ان کے فرائض، مقاصد اور لائحہ عمل کا تعین کرنا ہے، اس لئے اصولی طور پر کسی کشمکش کی گنجائش نہیں۔ لیکن عملاً صورت حال یہ ہو سکتی ہے کہ سرکاری ذرائع بھی تضاد کا شکار ہوں اور نجی ذرائع بھی کسی اصول کے پابند نہ ہوں۔ اس صورت میں معاشرہ کی یہ اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ ان اداروں کو راہ راست پر رکھے اور ان کی غلط روی پر مہم چلا کرے۔ اس کے لئے ایسا سیاسی نظام ہونا چاہیے کہ عوام کی آواز مؤثر ہو۔

اسلامی ممالک کے ذرائع ابلاغ میں خود اس طرح کا تضاد نہ ہونا چاہیے کہ تلاوت قرآن بھی ہو اور رقص و موسیقی بھی۔ اسلامی احکامات بتائے بھی جائیں اور ان کی کھلم کھلا خلاف ورزی بھی کی جائے۔ اس سے ٹوٹی شخصیتیں (Split Personalities) تشکیل پاتی ہیں اور کوئی مضبوط کردار تشکیل نہیں پاتا۔ اور اگر اس کے ساتھ ہی عملیہ ہو کہ نجی اداروں میں حکومت کا جہاں تک کنٹرول ہے وہ بھی درج بالا اصولوں کے مطابق استعمال نہ ہو بلکہ اس کے خلاف ہی استعمال ہو اور نجی ادارے بھی آزاد ہوں کہ چاہیں تو اسلامی نظریہ کے خلاف سرگرم ہوں۔ تو سب کچھ مل کر گورکھ دھندا تو بن سکتا ہے، اسلامی معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا۔

اسلامی حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے ماتحت اداروں میں قرآن و سنت کی پابندی اور نجات دہندہ سے اپنا پورا اختیار بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرے۔ اشاعتِ فحش کرنے والے جن کے لئے قرآن پاک میں وعید آئی ہے، سزا کے مستحق ہیں اور انہیں یہ سزا ملنا چاہیے۔ لیکن یہ بھی صورت میں ممکن ہے کہ فرد اور ریاست کے حقوق و فرائض قرآن و سنت کی بنیاد پر نافذ العمل ہوں۔ اہل حق کو کلمہ حق کہنے کی آزادی ہو۔ ریاست شہریوں پر ناروا پابندی نہ لگائے اور قرآن و سنت کی منشاء کے مطابق قانون سازی کرے اور اسے نافذ بھی کرے۔ خیر کے فروغ اور شر کے استیصال میں مسلمانوں کا اجتماعی خمیر کبھی مزاحمت نہیں کرے گا۔ امت کے مسلم معاشرہ میں بھی شیطان کے آلہ کار اقلیت میں ہی ہیں لیکن بدقسمتی سے انہیں موثر حیثیت حاصل ہے۔ مخلصانہ کوشش سے یہ صورت حال بدل سکتی ہے اور نظامِ تعلیم کے ساتھ ساتھ ذرائعِ ابلاغ بھی انقلاب سے ہلکا رہ سکتے ہیں۔ سٹ

تعلیمی ادارے کی چار دیواری میں تعلیم و تربیت کے عمل کے دوران میں جو عوامل بیرون سے طالب علم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے ضمن میں ہم نے گھر اور ذرائعِ ابلاغ پر بحث کی ہے۔ تیسرا عامل معاشرہ کی مجموعی فضا یا ماحول ہے۔

۳۔ ماحول — معاشرہ کی مجموعی فضا

کسی تعلیمی ادارے کو کتنا ہی مثالی کیوں نہ بنایا جائے اگر صورت حال یہی ہو کہ اس سے باہر نکلنے ہی طالب علم یا طالبہ کی نظر سینما کے بڑے بڑے اشتہارات پر پڑے، ایس میں بیٹھے تو فحش گانے اس کے کانوں میں بڑیں، بازار میں جائے تو دعوتِ نفاہ دینے والی خواتین سے قدم قدم پر سابقہ پڑے۔ رستہ چلتے باتیں کانوں میں پڑیں تو ان میں گایوں کا آزادانہ استعمال ہو، ہوٹل میں جائے تو کمانے پینے کے ساتھ فلمی گانے بھی مزور سماعت کرے۔ تفریح کا وہ جائے تو وہاں کے غیر قدرتی مناظر فضا کو مسموم کئے ہوئے ہوں۔ بک اسٹال پر کھڑا ہو جائے تو طرح طرح کے انداز سے رسالوں کے سرورق کی تصاویر اس کی توجہ طلب کر رہی ہوں، سفر پر نکلے تو کہیں آدابِ سفر کا لحاظ نہ پائے، رستہ گزارنے کے لئے رسالہ خریدے تو وہ جنس تشدد و رومان سے پر افسانوں پر مشتمل ہو، اور اگر ذرا گہری نظر سے دیکھے تو اسے معلوم ہو کہ معاشرہ میں جو موٹ اور رشوت کا رائج ہے۔ ہوا دہوس کا دھندہ درمہ اور حرام کمائی ترقی کا راستہ ہے، اسلامی عقائد و دینی کتابوں میں درج ہیں اور زندگیاں اس سے خالی ہیں۔ قرآن کی تلاوتیں ہیں لیکن طلق سے

نیچے نہیں جاتیں، نمازیں ہیں لیکن فحشا و منکر سے نہیں روکتیں۔۔۔ اگر طالب علم کی زندگی اس ماحول میں گذر رہی ہو تو نصاب اور استاد کیا کرے۔ اگر ان حالات میں وہ اپنے کو موسوم اثرات سے محفوظ رکھے اور فطری سلامیت طبع اور کچھ دیگر عوامل کی وجہ سے تقویٰ کی روش اختیار کئے رہے تو بلاشبہ یہ اس پرالٹا خاص فضل ہے لیکن ایسا ہونا ضروری نہیں کچھ تو ماحول سے اس حد تک اثر لیتے ہیں وہ اخلاقی اقدار کی پروا ہی نہیں کرتے۔ آخرت ان کے نزدیک کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اور پھر یہ منظر بھی معاشرے میں ہی نظر آتے ہیں کہ طالبات اور خواتین کو جھڑتے، آوازے کسنے اور اشارہ کرنے ہیں بعض طالب علم ہی بیش بیش ہو رہے ہیں۔

تحفیفات کے جدید طریقوں کو استعمال کرنے ہوئے تمام اجتماعیات کے اہلین آج نہیں کر سکتے ہیں کہ انسانی رویوں پر ماحول کے اثرات کس حد تک ہونے ہیں، لیکن اس انداز کی تحفیفات نہ ہوں تب بھی یہ امر ناقابل انکار ہے کہ کسی معاشرے میں بسنے والے لوگوں کے مجموعی کردار کا عمومی فضا اور ماحول سے تعلق ہوتا ہے۔ یہ بحث اٹھائی جاسکتی ہے کہ ماحول افراد کے مجموعی کردار کا اظہار ہوتا ہے یا مجموعی کردار ماحول کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتا ہے لیکن نئی پرورش پانے والی نسل کی حد تک تو یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ماحول ہی اسے بنانا یا بگاڑتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہرچہ مسلمان پسند کرتا ہے اور پھر لوگ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا رہے ہیں بنائے اور بگاڑنے کا عمل ہر سو ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اس کا ایک اثر تعلیمی ادارہ ہے جہاں شعوری طور پر زندگی کے چند سال تعلیم و تربیت کے لئے صرف کئے جاتے ہیں اور دوسرا دائرہ وہ ہے جس میں خود یہ ادارے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ان میں ہم آہنگی نہ ہو تو معاشرہ اور اس کی نئی نسل مسائل کا شکار ہو جاتی ہے۔

ایک مملکت جب تعلیمی نظام کی ٹیکس نوکرے جیسا کہ ایک اسلامی مملکت نظر بر اسلامی کے مطابق کرتی ہے تو اسے یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ طالب علم کی تربیت کا عمل تعلیمی ادارے کے باہر بھی جاری ہے۔

حکومت اور ذرائع ابلاغ کے علاوہ ایک اہم عنصر معاشرے کے قائدین، علماء، اہل دانش اور فنکاروں کا ہونا ہے۔ ان کی شخصیات اپنے اپنے دائرہ میں ایک اثر پیدا کرتی ہیں۔ ان کا مجموعی اثر ماحول میں کا ہے۔ نئی نسل کے لئے ان کی زندگی ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اچھا یا بُرا جو مندر پیش کیا جائے گا اس کو اختیار کرنے والے مل جائیں گے۔ اگر ائمہ مساجد اور علمائے کرام، اساتذہ اور سائنسدان، شعرا، ادبا اور فنکار

* کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام غابواہ یھودانہ اور نصیرانہ او یمجسانہ۔

ڈاکٹر اور استاد، 'ماجر' صنعت کار اور زمیندار سب کی زندگیوں میں رنگی ہوں اور زندگی اور فیضان کی آجمنہ دار نہ ہوں تو لامحالہ پورے معاشرے کو صنعتہ اللہ میں رنگنے میں مدد ہوں گی اور معاشرے کا ایک عام فرد پیچھے چلنے والا فرد، غور بخود اسی رنگ کو اختیار کرے گا لیکن اگر بہت سے پیچھے چلنے والے اپنے داعیہ کی بنا پر اسلامی زندگی گزار رہے ہوں لیکن قائدین اباحت پسند ہوں تو ماحول فائدہ کی عکاسی کرے گا۔ جو لوگ اسلامی نظام تعلیم کے نتائج افراد کی زندگیوں میں دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں انہیں یہ اتہام بھی کرنا چاہیے کہ معاشرے میں فسادت نیکو کار کریں اور بدکار شرمندہ و مجرم بن کے رہیں۔

ماحول کی تشکیل کا ایک دوسرا عنصر نظام تعلیم کے علاوہ معاشرے میں برپا دوسرے تمام نظام ہیں جن کا مجموعی تاثر بھی ماحول کی تشکیل کرنا ہے۔ سب کا احاطہ نہیں۔ صرف یہ اشارہ کافی ہے کہ مثلاً ملک کا اقتصادی اور تجارتی نظام کن اصولوں پر چل رہا ہے یا کھیلوں کے سلسلے میں کیا روایت ہے۔ اگر خواتین ہاکی کھیل رہی ہیں اور انہیں دیکھنے کی سہولت مردوں کو بھی ہے تو اس سے معاشرہ کا وہ ماحول تشکیل نہیں پاسکتا جو نصاب اور اسناد کا مددگار ہو کہ اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم و تربیت کا عمل نئی نسل کے لئے مکمل کرے۔

یہ مسلم معاشرے کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے ماحول میں مختلف اسباب سے بگاڑ کتنا ہی کم ہوں نہ پھیل جائے نیکی کی روایت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ اپنا اثر کرتی رہتی ہے۔ اسلام نے ایسے متعدد ادارے قائم کر دیئے ہیں (مثلاً نماز کا نظام) جو افراد کو نیکی پر قائم رکھتے ہیں۔ قرآن سے اور حدیث سے تعلق، خدا اور اس کے رسول سے محبت اور آخرت کی جوابدہی کا احساس وہ بنیادیں ہیں جو گئے گزرے حالات میں بھی مسلمانوں کو نہ صرف صراطِ مستقیم پر رکھتی ہیں بلکہ ماحول کو راہِ راست پر لانے کا داعیہ بھی زندہ رکھتی ہیں۔ بلاشبہ نظام تعلیم کے مکمل برگ و بار لانے کے لئے ماحول کو معاون اور مددگار ہونا چاہیے لیکن نظام تعلیم کے تحت تربیت پانے والی نسل میں یہ جذبہ بھی بیدار ہونا چاہیے کہ اگر ماحول درست نہیں ہے تو اسے راہِ راست پر لانا اور خدا اور اس کے رسول کی مرضی پورا کرنا ان کا فریضہ ہے۔ مختلف تدابیر کے ذریعے یہ مقصد کسی نہ کسی حد تک حاصل کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ حکومت

امت مسلمہ کو مقاصد تعلیم کے حصول کا جو فریضہ انجسام دینا ہے۔ اس کا ذریعہ، ریاست، معاشرہ اور برسرِ کار

حکومت ہے۔ حکومت کا ایک رول نورہ ہے جو اسے نظام تعلیم کی تشکیل، نصاب، درسی کتب، اساتذہ اور نوی و ملکی ضروریات کے مطابق منصوبہ بندی میں ادا کرنا ہے (اس پر نظام تعلیم کے بنیادی عناصر تین بحث ہوگی) اور دوسرا رول خالص تعلیمی پالیسی سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے دائروں میں اس کی کارفرمائی اثرانگیزی اور فیصلہ کن حیثیت سے متعلق ہے۔ ان دوسرے دائروں کی اہمیت کا کچھ ذکر ہو چکا ہے اور اسی ضمن میں حکومت کا رول بھی ضماً زیر بحث آچکا ہے لیکن درس گاہ سے باہر ہمہ وقت جاری تعلیمی عمل میں حکومت کے رول کی اہمیت الگ بحث کا نشانہ کرتی ہے۔

اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے۔ نظریہ کی رہنمائی زندگی کے ہر دائرہ کے لئے ہے۔ خصوصاً اسلامی نظریہ جس کا آغاز وحی الہی ہے انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام ممکنہ پہلوؤں کے بارے میں ہدایات دینا ہے۔ یہ صرف لفظی ہدایات نہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعد خلفائے راشدین کے دور بابرکت میں اس پر عمل کا مظاہرہ بھی ہو چکا ہے اور اسلامی تاریخ کے کئی دور ایسے گزرے ہیں جیسا امت نے ان ہدایات پر عمل کر کے اس کی برکتوں سے فائدہ اٹھا یا ہے۔ آج بھی اگر کسی ریاست کا نظریہ اسلام ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی حکومت کو اپنی ہر پالیسی میں رہنمائی اسی نظریہ سے حاصل کرنا چاہیئے۔ اگر عللاً ایسا ہو تو حکومت کی مجموعی قوت اور اس کے تمام ادارے انہی مقاصد کے حصول میں لگے ہوں گے جن کے حصول میں تعلیمی اداروں میں اساتذہ و طلبہ مصروف ہوں گے۔

گذشتہ چند صدیوں کا ایک عمل (Phenomenon) یہ بھی ہے کہ سائنسی ترقی اور نئی ایجادات کے ساتھ ساتھ حکومت کی قوت و طاقت میں بھی اضافہ ہوتا گیا ہے۔ ذرائع رسل و رسائل اور ابلاغ میں ایک حیرت انگیز انقلاب رونما ہو چکا ہے جو مسلسل نئی اہتزازوں کو چھو رہا ہے۔ ہر نئی ایجاد حکومت کی طاقت میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے۔ قانون سازی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ انسانوں اور اشیاء کی آمدورفت حکومت کی مرضی پر منحصر ہے۔ ایجادات نے حکومت کے ہاتھ اتنے لمبے کر دیئے ہیں کہ اس کی زد میں شہریوں کے تقریباً تمام بنیادی حقوق آگئے ہیں۔

اس صورتحال میں اگر حکومت کی رہنمائی کے لئے قرآن و سنت نہ ہوں جس میں فرد اور اجتماع کے حقوق میں مطلوبہ توازن رکھا گیا ہے تو افراط و تفریط کی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کی مثال آج کے دور بڑے نظماں حکومت پیش کر رہے ہیں۔ لیکن اسلامی ریاست کے کارپردازوں کے سامنے مقاصد واضح

ہوتے ہیں اس لئے ان کی پالیسیاں افراط و تفریط کا شکار نہیں ہونی چاہئیں۔ ریاست کی بڑھتی ہوئی قوت نے آج سے چند سو سال پہلے کی ریاست کے مقابلے میں آج کی اسلامی ریاست کے لئے یہ آسان کر دیا ہے کہ وہ حدود کے اندر رہ کر اپنی قوت کو مؤثر طور پر استعمال کرے اور فرار کی اس آزادی کو بھی تحفظ ملے جو اسے اسکے خالق نے دی ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے کہ اسلامی ریاست کو چاہیے کہ ذرائع ابلاغ کے باب میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی پالیسی اختیار کرے، اور ماحول کی تشکیل میں حصہ لینے والے عوامل کی نگرانی کرے کہ وہ قرآن و سنت کی بتائی ہوئی ہدایات کے مطابق ہوں۔ حکومت کو ایسی تدابیر بھی اختیار کرنا چاہئیں کہ اس کے نظام تعلیم سے فارغ ہونے والے معاشرہ میں رزق حلال کمائیں، رزق حرام کے ذرائع بند کئے جائیں۔ معاشی نظام اسلامی ہدایات کے مطابق تشکیل دیا جائے تاکہ سب مسلمانوں کو رزق حلال مہیا ہو، درآمد اور برآمد کی پالیسی بنانے میں اسلامی اقدار کا لحاظ رکھا جائے۔ کھیل و تفریح کی پالیسی میں بھی اسلامی احکامات کا دخل ہو۔ سیاسی نظام عدلیہ اور قانون کا نظام بھی ایسا ہو جو قرآن و سنت کے تقاضے پورے کرنا ہو اور معاشرہ سے رشوت، بد عزمانی، ظلم اور فریب کا خاتمہ کیا جائے۔ حق دار کو حق دیا جائے، پورے ظلم کی نہیں عدل و انصاف کی علمبردار ہو۔

جب قومی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کی کار فرمائی ہو، حکومت کی پوری مشینری اسلامی ہدایات کے تحت اور اسلامی ترجیحات کا لحاظ رکھ کر کام کرے، اور ریاست کی تمام پالیسیاں اسلام کے مطابق ہوں اور تعلیمی اداروں میں بھی اسلامی نظام تعلیم نافذ ہو تو یہاں سے تعلیم و تربیت پانے والی نسل بلاشبہ اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہوگی۔

لیکن یہ ایک مثالی صورتحال ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر ریاست کا نظام اسلامی خطوط پر نہ چل رہا ہو تو افراد کے اندر اسلامی سیرت و کردار کی پرورش ممکن ہی نہیں ہے۔ بالکل ممکن ہے لیکن یہ توقع محال ہوگی کہ بڑی اکثریت نمونہ کا سیرت و کردار لے کر نکلتے۔

ان سطور سے بہ واضح ہو جاتا ہے کہ زیر تعلیم نئی نسل کو اسلام کی خفایت پر مطمئن کرنے کے لئے کتابیں اپنی جگہ لیکن ارد گرد کا ماحول اور دوسرے تمام داندلوں میں حقیقی حکمران اسلام کو نظر آنا چاہیے۔ مقاصد تعلیم کے بیان کے بعد تعلیمی اداروں کے نظام سے پہلے درج بالا بحث اس لئے کی گئی ہے کہ بعد

کے تفصیلی مباحث کے لئے جو نظام تعلیم کے عناصر، طالب علم، استاد، کتاب وغیرہ پر مشتمل ہوں گے صحیح پس منظر فراہم ہو جائے۔ بہترین نتائج کے لئے ایک مکمل طور پر ہم آہنگ نظام درکار ہوتا ہے۔ معاشرہ کو ایک اکائی تصور کیا جائے تو تعلیمی ادارے اس کا وہ جزو ہیں جو نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے براہ راست متعلق ہیں بطور بالا میں دراصل یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ دوسرے ادارے متعلق نہیں ہیں یہ نہ صرف متعلق ہیں بلکہ تعلیمی ادارے کی چار دیواری کے اندر طلبہ و طالبات کی کردار سازی کی پوری کوشش بار آور ہونے یا نہ ہونے میں ان کا نہایت اہم ردل ہے۔

اس بحث سے قطع نظر، طالب علم اور استاد کی اپنی ایک ذمہ داری ہے۔ دسی کتب اسلامی نظریہ کی ترجمان نہ ہوں، معاشرہ میں غیر اسلامی اقدار کا غلبہ ہو، حکومت اسلام دشمن ہو، تب بھی یہ ذمہ داری ساقط نہیں ہوتی۔ کلمہ پڑھنے ہی جو فرائض ہر مسلمان پر عائد ہوتے ہیں وہ حالات پر منحصر نہیں ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشروں میں اسلامی تعلیم و تربیت کی روایت ناسازگار حالات میں بھی ہمیشہ قائم رہی ہے۔ ہم یہاں جو گفتگو کر رہے ہیں وہ ایک تصوراتی خاکہ کی ہے جس میں یقینی طور پر بہترین نتائج حاصل ہونا چاہئیں۔

۱۔ ان تفصیلات کا بیشتر حصہ مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن امریکا دیکنیڈا کی حسب ذیل کتاب سے ماخوذ ہے۔

- 1- Muslim Student's Association North America and Canada "A Guide for Muslim Parents and Teachers for End week Muslim Children" (1981).

۲۔ پنجاب یونیورسٹی "محور" صد سالہ نمبر " (مرتب سلیم منصور خالد، ظہور برلاس) مقالہ "ذرائع ابلاغ کا کردار اسلامی ریاست میں" از محمد صلاح الدین " ۱۹۸۲ء۔

رسمی تعلیم : چند بنیادی مسائل



نظام تعلیم کے بنیادی عناصر، استاد، طالب علم، کتاب و غیرہ پر کسی گفتگو سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس نظام سے متعلق بعض اہم پہلوؤں پر جو آج کے دور کے خصوصی مسائل ہیں بحث کی جائے۔ اور ان کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر متعین کیا جائے اور معلوم کیا جائے کہ ایک اسلامی ریاست میں ان مسائل کو کس طرح حل کیا جانا چاہیے۔

- ۱۔ بیشتر مسلم ملکوں میں دینی و مذہبی تعلیم اور جدید تعلیم کے دو متوازی نظام کام کر رہے ہیں۔ ایک اسلامی معاشرہ میں اس نوعیت کے علیادار اور متوازی دینی مدارس کا کیا مقام ہوگا؟
- ۲۔ تعلیمی اداروں میں علمی آزادی کے تصور کی وسعت کہاں تک ہوگی اور حکومت کے عمل دخل کی شکل کیا ہوگی؟

- ۳۔ کیا اسلامی ریاست نجی تعلیمی اداروں کی اجازت دے گی۔ اگر دے گی تو ان کی آزادی و خود مختاری کی حد کیا ہوں گی؟

- ۴۔ طبقاتی نظام تعلیم کا اسلامی تقورات کے تحت کیا مقام ہوگا؟
- ۵۔ تعلیم کے لئے وسائل کی فراہمی کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے گا۔

۱۔ دینی مدارس کا مقام

اسلامی ریاست کے نظام تعلیم کو پہلے قدم پر ہی مسلم دنیا کی اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑے گا کہ یہاں دینی اور دنیاوی تعلیم کے دو علیحدہ اور تقریباً متوازی نظام برسر کار ہیں۔ نوآبادیاتی دور کے تاریخی ورثہ کے طور پر یہ صورت حال مراکش سے انڈونیشیا تک ہر جگہ موجود ہے۔

دینی مدارس ایک منظم ادارہ ہیں جو اپنے وقت میں جدید علوم کے مراکز تھے اور مسلم ریاست کی تمام علمی و فنی ضرورت کو پورا کرتے تھے لیکن مغرب کے غلبہ کے نتیجے میں اور اس کی علمی ترقی سے اپنے کو علیحدہ رکھنے کی وجہ سے ان کی یہ اہمیت قائم نہ رہی۔ دورِ غلامی میں وہ اسلام کی شمع کو روشن رکھنے والے تھے اور اب حصول آزادی کے بعد وہ اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ایک ایسی حقیقت کے طور پر موجود ہیں جس سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ یہ اپنے طلبہ کی ابتداء سے انتہا تک مکمل تعلیم و تربیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ قیامی ہوتے ہیں اور یہاں طلبہ کے لئے کسی فیس کا تصور نہیں ہے۔ طلبہ اور اساتذہ جو کچھ بھی نصاب میں ہے اسے بڑی محنت سے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ مختلف مکاتب فکر کے اپنے اپنے مدارس ہیں اور فارغ التحصیل طلبہ اسی فکر کے نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ علماء عوام الناس کی مذہبی زندگی کے راہنما ہوتے ہیں۔ مسجد جیسا اہم ادارہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ دوسری طرف جدید تعلیم دینے والے ادارے ہیں یعنی اسکول، کالج، یونیورسٹی جو مغربی قدروں کے زیرِ اہتمام قائم ہوتے ہیں اور جہاں علوم اسی شکل میں پڑھائے جاتے ہیں جس شکل میں مغرب کی بے خدا تہذیب میں یہ مڈن کئے گئے ہیں۔ علوم اسلامی کے علاوہ ہر دائرہ میں تائید و ماہرین اور ملک کا نظم و نسق چلانے والے افراد تیار کرنے کا کام یہی ادارے انجام دے رہے ہیں۔ تعلیم کی مڑیں سرکاری بحث کے کل اخراجات دراصل ان اداروں پر ہوتے ہیں۔ نظامِ تعلیم سے مراد بالفعل یہی ادارے ہوتے ہیں۔

موجودہ مسلم معاشروں میں دو طرح کے نظام ہائے تعلیم سے دو مختلف انداز کی شخصیات تیار ہو رہی ہیں۔ یہ دونوں معاشرے ہیں اپنے اپنے رسوخ کے لحاظ سے مسلسل کشمکش کو برپا کئے ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی بھی مثالی اور مطلوبہ شخصیت نہیں — نئی نسل کو نہ اسلامی علوم سے بے بہرہ ہونا چاہیئے اور نہ جدید علوم سے — لیکن کیا اس کا حل یہ ہے کہ دینی مدارس میں جدید علوم کا اور اسکولوں اور کالجوں میں اسلامی علوم کا اضافہ کر دیا جائے۔

ماضی قریب کی مسلم تاریخ میں یہ دونوں تجربات کئے گئے ہیں۔ اگر ہم برصغیر ہند کے تجربات دیکھنا چاہیں تو دارالعلوم دیوبند کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ کا قیام اور علی گڑھ یونیورسٹی میں دینیات کی تدریس اس کی مثال ہیں۔ آج تک ان دونوں تجربات کے طرز پر ہی کوشش کی جا رہی ہے لیکن نتائج اطمینان بخش نہیں ہیں۔

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ وہ دونوں نظام تعلیم ختم کر دیئے جائیں جو اب تک ہمارے ہاں رائج رہے ہیں۔ پرانا مذہبی نظام تعلیم بھی ختم کیا جائے اور موجودہ نظام تعلیم بھی جو انگریزی راہنمائی میں قائم ہوا تھا ان دونوں کی جگہ ہمیں ایک نیا نظام تعلیم بنانا چاہیے جو ان کے نقائص سے پاک ہو اور ہماری ان ضرورتوں کو پورا کر سکے جو ہمیں ایک مسلمان قوم اور ایک آزاد قوم اور ایک نرنی کی خواہشمند قوم کی حیثیت سے لاحق ہیں۔

اس طرح کے ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت سے انکار امت مسلمہ کسی بھی خواہ کو نہیں ہے لیکن اس کی عملی شکل کیا ہوگی؟ زیر نظر مطالعہ بھی دراصل اس کے خطوط متین کرنے کی ایک کوشش ہی ہے۔

کسی بھی نظریاتی ریاست میں تعلیمی ادارے بنیادی طور پر ایک ہی جیسے مقاصد کے حصول کے لئے سرگرم اور ایک ہی لڑی میں پڑتے ہونا چاہئیں۔ اسلامی ریاست تو بالخصوص اس کی متقاضی ہے کہ نظام تعلیم اس کے نظریہ کے مطابق ہو اور ملک کی ہر طرح کی متنوع ضروریات کو بحسن و کمال پورا کرنے والا ہو۔

اس نقطہ نظر سے دینی مدارس کی کارکردگی کا مطالعہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ یہ مدارس اپنی خامیوں باوجود نصاب کے ازکار رفتہ ہونے اور مسکن کے اختلافات کے باوجود مسلم معاشرہ کی بے حد اہم ضروریات پورا کر رہے ہیں۔ مساجد کا قریہ قریہ انتظام عملاً ان ہی کے زیر اثر ہے۔ ائمہ اور موزن ان اداروں سے ہی حاصل ہوتے ہیں ابتدائی مرحلہ میں حفظ و تجوید القرآن کے لئے مساجد اور ملحقہ مدارس میں سہولت موجود ہے۔ معاشرے میں تجوید قرآن کا جو ذوق و شوق پایا جاتا ہے یا نئی نسل کے لئے نجی طور پر ناظرہ قرآن کی تدریس کا جو انتظام ہے وہ ان مدارس کا ہی رہنما منت ہے۔ دینی علوم کے اخصامی شعبوں علم الفیض، علم الحدیث، علم الفقہ، علم الکلام — کے ماہرین ان مدارس سے تعلیم پاتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ مدارس اپنی مفت تعلیم، اساتذہ و طلبہ کی محنت و شفقت، اساتذہ کی دنیاوی معاونتوں سے بے نیازی اور شاعت علم کو عبارت سمجھنے کی حقیقی اسلامی روایات کو آج بھی سینے سے لگاتے ہوئے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے دینی مزاج کا ایک ثبوت بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کے مدارس ہر مسلم ملک میں ہیں اور کثیر تعداد میں ہیں اور سرکاری امداد کے بغیر کامیابی سے چل رہے ہیں۔

یہ مدارس مسلم معاشرہ کی بعض ایسی اہم اور ناگزیر ضروریات پوری کر رہے ہیں جن کو مستقبل کے کسی اسلامی معاشرہ میں اس کے نظام تعلیم کو بھی پورا کرنا ہے۔ چنانچہ حکمت عملی یہ ہونا چاہیے کہ ان مدارس کو

ان کا صحیح اور جائز مقام ملے، یہ ضروریات بہتر اور مفید تر انداز سے پوری ہوں اور اس نقطہ نظر سے ان مدارس کے نظام میں جو اصلاح مطلوب ہے وہ کی جائے اور انہیں نئے نظام تعلیم کا جو درحقیقت اسلامی نظام تعلیم ہوگا اور اسلامی معاشرہ کی دیگر ضروریات پوری کرنے کے لئے تشکیل دیا جائے گا، جزو بنایا جائے اس بارے میں مختلف عملی تجاویز ہو سکتی ہیں جو موجودہ واقعاتی صورت حال کے پس منظر میں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ان میں حقیقی اشکال یہ پیش آتا ہے کہ یہ سمجھا جانے لگتا ہے کہ موجودہ دونوں طرز کے اداروں کو مدغم کیا جا رہا ہے۔ اگر تصوراتی خاکے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا جائے تو اسلامی معاشرہ میں جو نظام تعلیم قائم ہوگا وہ بچے کا پورا ہی اسلامی ہوگا، اس میں عربی مدارس کا مقام متعین کرنے میں کوئی اشکال پیش نہیں آتا۔

یہ عربی مدارس اسلامی نظام تعلیم کا Integral حصہ بننا چاہئیں جس طرح دیگر تعلیمی ادارے بنی ہو سکتے ہیں یہ مدارس بھی بنی ہو سکتے ہیں اور اپنے دائرہ کار میں خود مختار ہو سکتے ہیں ان کی ایک حیثیت جامعات کی طرح اعلیٰ تعلیمی اداروں کی ہو سکتی ہے جو علوم اسلامی کا مرکز ہوں جہاں ان کی مختلف شاخوں کے لئے علیحدہ شعبے قائم ہوں ان کی اپنی عظیم الشان لائبریریوں ہوں، اساتذہ اور طلبہ کی رہائش کے لئے معیاری انتظامات ہوں۔ یہ جامعات بارہویں جماعت کے بعد طلبہ اور طالبات کو ان کی علیحدہ جامعات میں داخلہ دیں اور یہاں سال کی مدت میں ان کی ان کے شعبہ اختصاص میں تعلیم و تربیت کریں (جس طرح طب، انجینئری، زراعت، قانون یا فنون یا تدریس کے شعبوں میں ہوتی ہے) دوسری حیثیت میں ان جامعات کی اپنی نگرانی میں ایسے مدارس اور کالج ہو سکتے ہیں جہاں ابتدائی لازمی تعلیم کے بعد ان طلبہ و طالبات کو علیحدہ اداروں میں ان کے علوم اسلامی کے لئے رجحان کے مطابق تعلیم دی جائے۔ یہ پورا نظام سرکاری وسائل سے سرکاری نگرانی میں بھی کام کر سکتا ہے، سرکاری اعانت سے نجی دائرہ میں کام کر سکتا ہے یا انفرادی اوقات کے تحت خود مختار ادارہ کے طور پر بھی کام کر سکتا ہے۔ یہ خود مختاری اسلامی ریاست کے مقاصد کے حصول کے ساتھ مشروط ہوگی جو ان مدارس میں بدرجہ اتم پورا ہونا ہی چاہئیں۔

موجودہ دینی مدارس میں "درس نظامی" رائج ہے اور اب معاشرتی تقاضوں کے تحت بعض مدرسوں میں کچھ نہ کچھ تبدیلی کا آغاز ہو گیا ہے۔ نصاب پر نظر ثانی خود علمائے کرام کا فریضہ ہے۔ اگر عمرانی علوم اور سائنسی علوم کی ایسی کتابیں تیار ہوں جو اسلامی نقطہ نظر سے تحریر کی گئی ہوں اور جو اسلامی تعلیم میں استعمال ہونا چاہئیں تو ان مدارس کو ان کتابوں کو درسی کتب کے طور پر اختیار کرنے میں عذر نہ ہوگا لیکن سائنس کی موجودہ کتابیں

جو پڑھنے والے کو محمد بناتی، میں، یہ مدارس اگر نہیں پڑھاتے تو اس کا کچھ نہ کچھ جواز غالباً ہے۔
(اس بارے میں مزید وضاحت تعلیمی اداروں کے باب میں کی جائے گی)

۲۔ نظریاتی ریاست اور علمی آزادی

اللہ تعالیٰ نے انسانی ذہن کو غور و فکر کی صلاحیت سے نوازا ہے اور اپنی کتاب میں بار بار انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ غور و فکر کرے اور عقل سے کام لے۔ تعظیم ذہن کی اسی صلاحیت کو جلا بخشی ہے اور انسان بہتر طور پر اس صلاحیت سے کام لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صلاحیت کو استعمال کرنے کی کوئی حد و خالق نے متعین کی ہیں یا نہیں اور اگر کی ہیں تو وہ کیا ہیں ؟

مغرب نے عقلیت پسندی اور برہنہ کے تصور کے تحت ذہن کو کس قسم کی حدود کے بغیر آزادی کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اس سے نہ صرف تمام علوم بلکہ علمی رویے متاثر ہوتے ہیں۔ علوم کے بنیادی تصورات اس کا مظہر ہیں۔ عمرانی علوم ہوں یا طبعی اور حیاتیاتی علوم ہوں یا ادب و فنون، ہر جگہ عقلیت پسندی اور برہنہ کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اسی طرح علمی رویوں کا مطالعہ کیا جائے تو مادر پدر آزادی کے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جدید تعلیم کے ساتھ یہ سب علوم اور رویے مسلم دنیا میں بھی در آئے ہیں۔ یہ صورت حال ہمارے اوپر قائم کردہ سوال کے لئے پس منظر فراہم کرتی ہے۔

اس سوال کو زیادہ واضح اور علمی شکل میں، اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی ریاست کی کسی جامعہ یا کسی بھی تعلیمی ادارے میں کوئی استاد علمی آزادی کے تصور کے تحت یہ حق طلب کرنے میں حق بجانب ہو گا یا نہیں کہ وہ علوم کے ان تصورات کو درست قرار دیتے ہوئے پڑھائے جو اسلامی عقائد اور تصورات کی نفی کرتے ہوں یا اپنے طلبہ میں ان رویوں اور طریقوں کی ترویج کرے جو بدیہی طور پر اسلامی طرز زندگی کے خلاف ہوں۔

اسلام کوئی ایسا دین نہیں جو انسان کی سوچ پر پھرے بٹھائے۔ روایتی مذہب کی طرح وہ عقل و فکر کے استعمال کو گردن زدنی قرار دینے والا بھی نہیں ہے بلکہ اس کا رویہ اس باب میں مثبت اور حقائق پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اس کائنات کی بنیادی حقیقتوں کے بارے میں علم، یقینی علم حاصل

کرنے کے لئے وحی الہی کی رہنمائی کا محتاج ہے۔ وحی الہی کی رہنمائی انسانی عقل کو گمراہی سے محفوظ رکھتی ہے اور اسے صحیح راہ پر آگے بڑھنے، کائنات میں اللہ تعالیٰ کے کارفرما قوانین کو سمجھنے اور نئی ایجادات و اکتشافات کے لئے راستہ دکھاتی ہے۔

اسلامی فکر اور جدید مغربی فکر کا یہ بنیادی فرق سمجھ لینا چاہیے کہ مغربی فکر کے تحت عقل آزاد ہے۔ اس کے لئے کوئی نگرہ نہیں ہے۔ نہ اس کے لئے کوئی محور ہے۔ مغربی فکر کے تحت تعلیم پانے والوں کو یہ تصور بڑا سہلنا، بڑا عقلی لگتا ہے لیکن اس مغربی فکر کے اثر سے آزاد ہو کر حقیقتاً آزاد ذہن سے سوچا جائے تو یہ سامنے کی بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ عقل کو اس کی حُدود سے ماوراء میدانوں میں راہنما بنایا جائے گا تو یہ انسانیت کے لئے پریشانی کا باعث ہوگا۔ ایک حدیث کے مطابق خود اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ جب تک تمہارا ذہن اللہ کی معرفت کے حصول کے لئے سوال کرے۔ تم اس کے جواب چل کر دینے لگے۔ لیکن جب سوال یہ ہو جائے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟ تو سوالات کا سلسلہ ختم کر دو۔ اس طرح دراصل آزادیٰ فکر پر پابندی نہیں لگائی گئی بلکہ فکر کو اس کی حُدود کا درس دیا گیا ہے جس حقیقت تک انسان صدیوں کی گمراہی اور نقصان اٹھانے کے بعد پہنچے وہ — اگر وہ عقل سلیم استعمال کرے — تو پہلے قدم پر ہی اس کے لئے واضح گف انداز میں موجود رہے۔ عقل کی بات تو یہ ہے کہ عقل کو اس کی حُدود کے اندر رکھا جائے۔

قرآن کریم نے معرفت الہی کے لئے حضرت ابراہیم کے ذہنی سفر کی جو روداد بیان کی ہے وہ بھی ہمارے لئے نشان راہ ہے کہ کس طرح سوز چاند ستارے یا دوسرے آثار کائنات انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں لیکن اگر انسان غور کرے تو وہ ان سب کے خالق تک پہنچ سکتا ہے۔ مسلمانوں کی صدیوں کی علمی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ ذہن و فکر کو ایمان کی بنیاد پر استوار کر کے انہوں نے اس دنیا میں وہ علمی و سائنسی کارنامے انجام دیئے جو جدید سائنسی اکتشافات کی حقیقی بنیاد بنائے جاتے ہیں۔ یہ اسی لئے ممکن ہوا کہ مسلمانوں کو ان کے مذہب نے اور ان کی کتاب ہدایت نے، اس کا راستہ دکھایا تھا۔

درج بالا بحث سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے جو آغاز میں اٹھایا گیا تھا۔ لیکن اسے مزید اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلامی تصور جمہوریت کے تحت، عوام اقتدار اعلیٰ کے مالک نہیں ہوتے اور امت مسلمہ کی کوئی پارلیمنٹ مل جل کر قرآن کے بیان کردہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں

کر سکتی۔ انسان اس کو اپنی آزادی پر پابندی سمجھے تو یہ اس کی کم فہمی اور نادانی ہے۔ دراصل وہ اس طرح گمراہی سے اور نقصان سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح علمی دائرہ ہے جہاں اگر کوئی دلائل و براہین سے یہ ثابت کرے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا کوئی نہیں، کسی نے انسان کے لئے گمراہی کا نظام نہیں کیا اور انجام کار اس دنیا کے اختتام پر حساب کتاب نہ ہوگا۔ تو یہ علمی کاوش نہیں گمراہی اور جہالت قرار دی جائے گی۔

اگر دورِ جدید کی کسی نظریاتی ریاست کا مطالعہ کیا جائے تو بھی یہ حقیقت جو شاید مغرب کی تربیت کے تحت کسی کو تنگ نظری محسوس ہوتی ہو، ایک ناگزیر امر واقعہ کی شکل میں نظر آتی ہے۔ کیا یہ توحید کی جاسکتی ہے کہ کسی حقیقی اشتراکِ ریاست میں، تعلیمی اداروں میں خدا کے وجود کے اثبات کے دلائل پڑھائے جائیں یا اگر کوئی استادیہ حق استعمال کرے تو وہ سلامت بھی رہے۔ ایک نظریاتی ریاست کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور اسلامی ریاست اس سے ممتاز نہیں۔ کوئی ریاست بھی یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ اس کی بنیاد پر ضرب لگائی جائے۔ جب نظریہ ہی ریاست کی بنیاد ہو تو ریاست سب سے زیادہ حساس اس کے لئے ہوتی ہے اور اس کو اپنا فریضہ سمجھتی ہے کہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس کی مضبوطی کے اسباب فراہم کرے کجا کہ وہ اسے کمزور کرنے کی سعی کی اجازت دے، یا اسے نظر انداز کرے۔

اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے نظامِ تعلیم میں یہ اہتمام ہونا چاہیے کہ اس کے تعلیمی اداروں میں علمی آزادی ضرور ہو لیکن حد کے اندر ہو۔ نہ صرف تمام نصیباتِ نظریہ اسلامی کے مطابق ہوں بلکہ اساتذہ کے تقرروا انتخاب، ان کی روزمرہ کارکردگی، ترقی و تنزل، طلبہ کی اجتماعی سرگرمیاں، حکومت کے احکامات و ہدایات سب میں ان حد کا احترام ملحوظ رکھا جائے اور آزادی کو اس کے حقیقی مفہوم میں استعمال کیا جائے۔

۳۔ نجی تعلیمی ادارے اور اسلامی ریاست

اس مطالعہ میں جس نظامِ تعلیم کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ اس انداز سے پیش کیا جا رہا ہے کہ اس نظامِ تعلیم کو ایک حکومت کی جانب سے اس کے شہریوں کے لئے قائم و جاری کیا جانا ہے۔

لیکن دوسری طرف یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی روایت یہ رہی ہے کہ تعلیمی ادارے حکومت کے عمل دخل اور اثرات سے آزاد رہے ہیں۔ حکومتوں نے اہل علم کی سرپرستی تو کی ہے لیکن تعلیمی اداروں کے انتظام و انصرام کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا ہے۔

جدید دور میں ریاست کے اختیارات اور حدود کار میں اضافہ کے بعد، ہم کسی ایسی ریاست کا تصور نہیں کر سکتے جو تعلیم کے دائرہ کو مکمل طور پر بنی شعبہ کے لئے چھوڑ دے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تسلیم اور تحقیق اسے وسائل اور ریاست قومی ضروریات کے لحاظ سے اتنی منصوبہ بندی کا تقاضا کرتی ہے کہ ریاست کی براہ راست شرکت ناگزیر ہے۔ آج کے دور میں نظریاتی ریاست کا تقاضا اس کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا کہ حکومت نہ صرف تعلیمی ادارے کھولے بلکہ ان کی مکمل نگرانی بھی کرے اور دیکھے کہ وہ اپنے مقاصد پورے کر رہے ہیں یا نہیں۔

ریاست کے مکمل کنٹرول کے اچھے پہلو بھی ہیں اور برے پہلو بھی۔ برے پہلو اس لحاظ سے کہ اگر کسی مرحلہ پر حکومت کچھ طالع آزمائے افراد کے ہاتھ میں آجائے تو وہ تعلیم کے منظم ادارے کو ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کریں گے۔ ایسے موقعوں پر تعلیمی اداروں کی آزادی ہی اُمید کی کرن ہوگی لیکن اگر ہم کسی مثالی صورت حال کی بات کریں یعنی حکمران نظریہ کے حقیقی محافظ ہوں تو وہاں پورا نظام تعلیم حکومت کی تحویل میں ہونے سے، اندیشے و خطرات نہیں ہوتے بلکہ ان سے تحفظ کی ضمانت ملتی ہے لیکن اسلامی معاشرہ میں مطلوب کیا ہے؟

اگر ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے اشتراکی ریاستوں کے نظام تعلیم کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان ممالک میں تعلیم سو فیصد حکومت کے کنٹرول میں ہے۔ صرف حکومت ہی تعلیمی ادارے کھولتی اور چلاتی ہے کسی فرد یا بنی ادارے کو یہ اجازت نہیں ہوتی کہ وہ تعلیمی ادارہ قائم کرے اور چلائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس بارے میں اسلامی ریاست کی پالیسی کیا ہوگی۔ اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے یہ باتیں پیش نظر رکھنا چاہئیں۔

۱۔ اسلامی ریاست ان معنوں میں کوئی نظریاتی ریاست نہیں ہے جہاں ایک گروہ عوام کی مرضی، خواہش اور ان کی فطرت کے خلاف نظریہ زندگی ان پر ٹھونس رہا ہو۔ اور ان کو زبردستی اس طرح ذہنی غسل دے رہا ہو کہ وہ اس کی حکومت و سیاست کو دمام

بچنے کے کل پرزے بننے کے علاوہ کچھ نہ سوچ سکیں۔ اسلامی ریاست میں نظریہ کا تحفظ و مہل عوام کی ذمہ داری ہے اور حکومت عوام کے حقیقی نمائندہ کی حیثیت سے اس کے تقاضے پورے کرنے والا ادارہ ہے۔ عوام اور حکومت کے درمیان باہمی اعتماد کی خوشگوار فضا اسلامی معاشرہ کی خصوصیت ہے۔ مقاصد کی ہم آہنگی کوششوں کو تیز تر بھی کرتی ہے اور نتیجہ خیز بھی بناتی ہے۔

۲۔ مسلمانوں کی تاریخی روایت 'دینی تربیت اور دولت کے تقاضوں کے احساس کے تحت مسلم معاشرہ کے افراد تعلیم کے دائرہ میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہتے ہیں اور خدمت کے جذبے سے تعلیمی اداروں کے قیام میں وسائل اور صلاحیتیں لگانا چاہتے ہیں حکومت کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ مسلمانوں میں اس جذبے کو پر دان چڑھائے۔

۳۔ ایک مسلم معاشرہ کا ہدف سو فیصد افراد کے لئے تعلیمی سہولت کی فراہمی ہے اور تعلیمی سہولت بھی اعلیٰ معیار کی۔ اور دوسری طرف جدید ریاست کی ضروریات کے لحاظ سے 'تعلیمی و تربیتی اداروں کا قیام ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ الاما شاء اللہ مسلم مملکتیں تعلیم کے لئے وہ وسائل فراہم نہیں کر سکتیں جو ایک اسلامی مملکت میں تعلیم کی اہمیت کا تقاضا ہے اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ حکومت اس کوشش میں عوام کو بڑے پیمانے پر شریک کرے۔

اس بحث کی روشنی میں نجی تعلیمی اداروں کے باب میں اسلامی ریاست کی پالیسی کے بنیادی نکات یہ ہوں گے۔

- ۱۔ نجی تعلیمی اداروں کے قیام کی نہ صرف اجازت دی جائے بلکہ حوصلہ افزائی کی جائے
- ۲۔ ذاتی طور پر افراد کے بجائے ایسے اداروں کو اجازت دی جائے جن کے ساتھ ایسے وقف ہوں جن کی آمدنی تعلیمی اداروں پر خرچ ہو۔ ادارے کھولنے والے بنیادی طور پر کاروبار کے لئے نہیں بلکہ امت مسلمہ کی خدمت، حکومت کی تعلیمی کوششوں میں تعاون

اور اپنے دینی فریضہ کے لئے اس میدان میں آرہے ہوں۔ *

۳۔ یہ تعلیمی ادارے حکومت کی مجموعی تعلیمی اسکیم کا جزو ہوں۔ اس سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ یہاں وہی نصاب پڑھایا جائے۔ جو سرکاری تعلیمی اداروں میں پڑھایا جائے اور طالب علم وہی امتحانات دیں جو سرکاری تعلیمی اداروں کے طالب علم دیں۔ اساتذہ کو وہی مشاہرے اور مراعات ملیں جو سرکاری اداروں میں ملیں۔ جسطرح سرکاری نظام میں مملوٹ ادارے منوع ہوں، یہاں بھی ہوں

۴۔ بنی اداروں کو منصوبہ کے تحت رکھنے کے لئے مناسب ہوگا کہ سرکاری منصوبہ میں نشاندہی کی جائے کہ کس کس مقام پر کس کس نوعیت کے تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے جس کے لئے وسائل کی کمی ہے اور بنی شعبہ آگے بڑھ کر ان اداروں کی ذمہ داری اٹھائے یا حکومت جزوی طور پر وسائل فراہم کرے، بقیہ کے لئے بنی شعبہ آگے آئے۔

۵۔ حکومت جس طرح اپنے تعلیمی اداروں کی نگرانی کرے۔ بنی اداروں کی نگرانی کا نظام بھی قائم کرے تاکہ ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے وہ یہ نظر رکھ سکے کہ یہ تعلیمی ادارے ریاست کے مجموعی تعلیمی مقاصد کے حصول میں مدد دہرے ہیں، یا نہیں۔

۶۔ بنی تعلیمی ادارے جن مقاصد کا ذریعہ بنتے ہیں ان کے سدباب کا موثر انتظام کیا جائے یہ اجازت نہ دی جائے کہ ملک کے عام معیار سے مختلف پراساتش ادارے قائم کئے جائیں جہاں مخصوص طبقات کے افراد تعلیم حاصل کریں۔ نہ یہ اجازت ہو کہ اساتذہ کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر انہیں قلیل مشاہرے دیتے جائیں اور ان کا استحصال کیا جائے۔ نہ یہ اجازت ہو کہ ان اداروں کو اخلاقی مقاصد کا مرکز بنایا جائے۔ نہ انہیں

* ”وقف“ مسلم تہذیب کا ایک ایسا ادارہ ہے جس کے ذریعے عظیم فلاحی کام انجام پاتے۔ آج بھی بے شمار دینی مدارس کے تمام تر اخراجات حکومت کی سرپرستی کے بغیر ہی پورا ہوتے ہیں۔ مستقبل کی اسلامی ریاست کے تعلیمی اداروں کو مالی مشکلات کا شکار نہ ہونا پڑے گا، شرط صرف یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کا فیضان کے چلانے کو اپنا دینی تقاضا تصور کرے۔

کاروبار اور منافع خودی کا ذریعہ بننے دیا جانے — ان سب امور کے لئے حکومت کی — اسلامی حکومت کی — موثر نگرانی ہو — ایسے قوانین بھی بنائے جاسکتے ہیں جن کی خلاف ورزی مستوجب سزا ہو اور بددیانت، خائن اور امت کے فوجوالوں کے مستقبل سے کیلئے دالوں کو اپنے کئے کی سزا مل سکے۔

۴۔ طبقاتی تعلیم اور اسلامی نظام تعلیم

تعلیم کے حوالے سے دور جدید کا ایک اہم مسئلہ معاشرہ کے مختلف طبقات کیلئے مختلف نوعیت اور معیار کی تعلیم کی فراہمی اور اس کی وجہ سے ایک ایسے مراعات یافتہ طبقہ کا وجود میں آنا ہے جو مخصوص تعلیم کی بنیاد پر اپنی بالادستی کو مسلسل قائم رکھتا ہے اور معاشرے کے محروم طبقہ کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اس نوعیت کی تعلیم حاصل کرے اور اس بالادستی کو توڑے۔ اس صورتحال سے بے شمار معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی مسائل جنم لے رہے ہیں۔ مسلم معاشروں میں بھی یہ مسئلہ تعلیم کے مسائل میں سرفہرست ہے۔ ہم ان صفحات میں کوشش کریں گے کہ اسلامی نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیں۔

یہ مسئلہ مسلم معاشروں میں نوآبادیاتی دور کا ورثہ ہے۔ غیر ملکی آقاؤں نے تعلیم کو ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر اس لئے استعمال کیا کہ مقامی آبادی میں ایک ایسا طبقہ وجود میں لائیں جو ان کا وفادار، اور ان کے مذہب اور تہذیب کا نمائندہ ہو اور اس کا رشتہ اپنے وطن اور معاشرے سے کٹ جاتے چمچاچے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وفادار اہل امراء و رؤسا کے لئے علیحدہ نصاب اور اعلیٰ سہولتوں کے تعلیمی ادارے قائم ہوئے، مشنری اسکول کھولے گئے تاکہ مقامی آبادی کے ذہین بچے دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ تہذیب، مغرب اور عیسائیت کا درس بھی حاصل کریں۔ دوسری طرف عام اسکول کھولے گئے جہاں پسماندہ خاندانوں کے بچے مشنری، پٹواری، ڈائیکے اور کلرک بننے کے لئے تیار ہوں۔ فوج کے لئے مخصوص تربیتی ادارے قائم کئے گئے جہاں صرف اعلیٰ خاندانوں کے افراد کمیشن حاصل کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مصنف کے مطابق ”ہندی قوم کو تقسیم کر کے یا تقسیم کرنے کے لئے ہر بچے کی تعلیمی زندگی کا نقطہ آغاز اس کے خاندانی پس منظر اور معاشرتی حیثیت کے مطابق الگ الگ مقرر کر دیا اور اسے قدم بڑھانے کے لئے مخصوص راستے ہٹا کر دیئے گئے۔ ہر راستے کی سہولیتیں اور راحتیں جدا، زادراہ جدا، مسافت جدا اور منزل جدا گویا تعلیم جنس، خریداری بن گئی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ

میں تقسیم ہو گئی۔ اور اس تفریق نے تقسیم در تقسیم کا ایسا پیکر چلایا کہ رداستی خاندان منقسم ہو کر نئے معاشی اور معاشرتی خاندان وجود میں آ گئے۔ نئی تہذیبی اکائیاں وجود میں آئیں۔ ایک ہی قوم کے افراد الگ الگ مداروں میں گردش کرنے لگے، ان کی بستیاں جدا ہو گئیں۔ ان کے معاشرتی روابط کا دائرہ بدل گیا۔ ان کے بازار تفریحی مقامات، دلچسپیوں کے مراکز، طرز بورڈر باش، انداز گفتگو، لباس و آداب، کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے، استعمال کی اشیاء حتیٰ کہ فکر و نظر کے بیانیے سب جدا ہو گئے۔ ہم آہنگی بگاڑ گئی اور انفرادیت و تعاون کے رشتے مخصوص طبقاتی گروہ میں سمٹ کر رہ گئے۔“ ۷

امت مسلمہ کا المیہ یہ ہے کہ مسلم ممالک میں حصول آزادی کو طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی یہ صورتحال بڑی حد تک برقرار ہے۔ جب کہ یہ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اس کے اسی مزاج کے خلاف ہے۔ جو دین عدل و معاشرتی مساوات کی اقدار کا علمبردار ہو، وہ اس طرح کے نظام تعلیم کو کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ تعلیم کی تاریخ بیان کی جائے تو مسلمانوں کو یکساں تعلیمی مواقع کے تصور کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کئی سو سال تک مکاتب، مدارس اور مساجد کا ایک ایسا جال پھیلانے لکھا جہاں ہر شہری کو حصول علم کے یکساں مواقع حاصل تھے۔ ایک طرح کی تعلیم تھی جو پڑھنے والوں کو طبقات میں تقسیم نہ کرتی تھی بلکہ ایک خطہ کا بندہ اور ایک امت مسلمہ کا فرد بناتی تھی۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم کی خصوصیات میں سے اولین یہ بیان کی جاتی ہے کہ تعلیم کو جمہوری کر دیا گیا تھا جس طرح مسجد میں سب برابر ہوتے تھے اسی طرح مکتب و مدرسہ میں برابر ہوتے تھے۔ یہ اصول تسلیم کر لیا گیا کہ غریب کے لئے بھی تعلیم کا سادی حق ہے۔ موجودہ دور کی کوئی ریاست اگر اسلامی نظام تعلیم نافذ کرے تو اس کی یہ لازمی خصوصیت ہونا چاہیے کہ تعلیم کے ذریعے اعلیٰ ترین منصب و مقام تک پہنچنے کا ہر شہری کے لئے برابر کا موقع ہو۔ اسلامی ریاست میں امیر بھی ہوں گے اور غریب بھی ہوں گے لیکن جس طرح امارت و غربت کے باوجود قانون کی نظر میں سب شہری مساوی ہوتے ہیں اسی طرح حصول علم کے مواقع کے لحاظ سے بھی انہیں مساوی ہونا چاہیے۔ اسلامی ریاست کو چاہیے کہ تعلیم کو معاشرتی عدل کے قیام کے موثر سہیاد کے طور پر استعمال کرے اور ایسی تدابیر اختیار کرے کہ یہ مقصد لازماً حاصل ہو۔ جہاں اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ کوئی سرے سے تعلیم سے محروم ہو کر ایک الگ محروم طبقہ نہ بن جائے وہاں یہ بھی ہے کہ محض خاندانی پس منظر کی وجہ سے کسی کو خصوصی تعلیمی اداروں میں حصول علم کا موقع نہ ملے۔ اس کے لئے اسلامی ریاست کی بنیادی تدبیر یہ ہونا چاہیے کہ اس کے نظام میں اس

نوعیت کے مخصوص ادارے سرے سے نہ ہوں جو کسی مراعات یافتہ طبقہ کی بالادستی قائم کرنے کا ذریعہ بنیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلوں کا اور بعد میں ملازمتوں کا نظام اس طرح بنایا جائے کہ محض قابلیت کی بنیاد پر مقابلہ ہو اور قابل ترین کو آگے بڑھنے کا موقع ملے۔ جب تک کسی معاشرہ میں تعلیم کے لئے برابر کے مواقع کے اصول کو حقیقی اسپرٹ کے ساتھ باہتمام و کمال نافذ نہیں کیا جاتا، نہ عدل اسلامی کا تقاضا پورا ہوگا اور نہ وہاں نوآبادیاتی دور کے اس دورے سے چھٹکارا پایا جاسکے گا جو آج بھی طبقاتی تعلیم کی صورت میں امت مسلمہ میں فساد و انتشار کا باعث ہے اور اس کی ترقی و کامرانی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

تعلیم کے لئے وسائل کی فراہمی کا مسئلہ

تعلیم کے لئے وسائل کی فراہمی، تیل کی دولت سے مالا مال چند مسلم ممالک کے علاوہ دیگر تمام مسلم ممالک کے لئے ایک سنگین مسئلہ ہے۔ تعلیم کو عام کرنے، ابتدائی اور بنیادی تعلیم ہر شہری کے لئے قابل حصول بنانے اور قومی و ملی ضروریات کی تکمیل کے لئے اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم کرنے کا ہدف حاصل کرنے کے لئے اور وہ بھی اس طرح کہ یہ تمام ادارے قابل اساتذہ ماہرین اور مناسب تعلیمی سہولتوں سے لیس ہوں اور وسائل کی کمی تعلیمی معیار کے حصول میں آڑے نہ آئے، غیر معمولی وسائل کی ضرورت ہے۔ جدید تقاضوں کے تحت اعلیٰ تعلیم کے مناسب اداروں کے قیام اور ان کے چلانے میں جو قومات خرچ ہوتی ہیں ان کا پہلے زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ عمارات، لائبریریاں، ہوسٹل، کتابیں، سٹیشنری، سائنس لیبارٹریاں، کھیل کے میدان، بورڈ کھیل کے سامان سب مصارف کا تقاضا کرتے ہیں۔ لیکن ایک اسلامی معاشرہ کسی قیمت پر بھی ان اہداف کے حصول کو پس پشت نہیں ڈال سکتا۔ محض وسائل کی کمی کا عذر کسی طرح بھی روا نہیں جس طرح ایک خاندان اپنے فوہنلوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے مستقبل کی خاطر آج اپنا پیٹ کاٹنے کے لئے تیار ہوتا ہے، اسی طرح ایک اسلامی معاشرہ اپنے کل فرزندوں کی تعلیم کا انتظام ضرور کرے گا خواہ اس کے لئے دوسرے شعبوں میں عارضی طور پر قربانیاں دینا پڑیں۔

دنیا میں اس وقت اس مسئلہ کو حل کرنے کی مختلف مثالیں موجود ہیں۔ کسی کلیت پر سبند ریاست کے لئے مسئلہ کا سیدھا حل یہ ہے کہ جتنی بھی ضرورت ہے لوگوں پر ٹیکس لگا کر پوری کر لی جائے۔ کل رقم ریاست کے پاس جمع ہو ادیہ ہیں سے خرچ ہو۔ ایک حل یہ بھی ہے کہ جو تعلیم حاصل کی جائے اس کی قیمت ادا

کی جائے۔ یہ دونوں حل اسلامی معاشرہ کے مزاج کے مطابق نہیں ہیں۔ پہلی صورت میں تعلیم کا انتظام مکمل طور پر ریاست کے قبضہ میں لانا لازم ہے۔ یہ کوئی مطلوبہ صورت حال نہیں۔ دوسری صورت میں تعلیم کے ساتھ ایک قابل خرید و فروخت شے کا تصور در آتا ہے جو اسلامی تصورات کے مطابق نہیں ہے۔ اس کا یہ پہلو بھی قابل قبول نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے طبقاتی تقسیم کو فروغ حاصل ہوگا جو زیادہ قیمت دے سکتا ہے وہ بہتر تعلیم حاصل کرے اور جو کم قیمت دے سکتا ہے وہ کمتر تعلیم حاصل کرے۔ اسلامی معاشرہ میں تعلیم سب کی ذمہ داری ہے۔ ایک فرد انفرادی طور پر والدین سربراہ خاندان کی حیثیت سے ریاست اور دیگر اجتماعی ادارے معاشرہ کے نمائندوں کی حیثیت سے اپنی اپنی استطاعت کی حد تک ذمہ دار ہیں۔ اگر وسائل کی تنگی ہے اور یہ تعلیمی کوشش میں آڑے آرہی ہے تو ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھے۔

۱۔ ریاست کو اپنے موجودہ وسائل میں سے نظریاتی ریاست میں تعلیم کی اہمیت کا لحاظ رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ حصہ تعلیم کے لئے مختص کرنا چاہیے۔

۲۔ معاشرہ کے اہل خیر افراد کو بڑے پیمانے پر وقف قائم کرنا چاہیے جو عمومی بھی ہو سکتے ہیں اور کسی خاص مصرف کے لئے مخصوص بھی ہو سکتے ہیں۔ کسی بھی خاص علاقے کے لئے کسی خاص نوعیت کی تعلیم کے لئے کسی خاص تعلیمی ضرورت کے لئے علیحدہ اوقات قائم ہو سکتے ہیں۔ یہ کام اسلامی معاشرہ میں اتنے بڑے پیمانے پر ہونا چاہیے کہ ریاست کا بار بڑی حد تک بٹ جائے۔

۳۔ تعلیمی مدد کے لئے حکومت خصوصی تعلیمی ٹیکس لگا سکتی ہے تاکہ ہر صاحب حیثیت اپنی آمدنی کے لحاظ سے تعلیم جیسے معاشرتی عمل میں شرکت کر سکے۔

تعلیمی میدان میں نجی شعبہ کو وسائل کی فراہمی میں اس کا حقیقی کردار ادا کرنے کا موقع دینے کے لئے تعلیمی نظام کو دو شرائط پوری کرنا چاہیے۔

۱۔ معاشرہ کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ یہ تعلیم ایک دینی فریضہ ہے۔ یہ احساس جب ہی ہوگا جب لوگ واقعتاً متاہدہ کریں گے کہ نظام تعلیم اسلامی ہے اور انکے بچوں میں اسلامی کردار اور مطلوبہ قابلیت و مہارت پیدا کر رہا ہے۔

۲۔ تعلیمی اداروں کو روزمرہ معاملات میں سرکاری عمل دخل سے آزاد ہونا چاہیے۔ پالیسی

اور نصاب کی حد تک حکومت کی راہنمائی ہو اور اس کی پابندی ضرور کروائی جائے لیکن انتظامی معاملات میں آزادی ہو۔

یہ دو شرائط پوری ہوں تو توقع کی جاسکتی ہے کہ اسلامی معاشرہ کے مجموعی وسائل تعلیم کے مصارف کو برداشت کریں اور ہر مرحلہ پر تعلیم بلا قیمت ہیا کی جائے۔ اس پر بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ تعلیمی انتظامیہ پر ریاست کی بالادستی نہ ہو، مرکزی انتظامیہ کے تحت زیریں سطح کی انتظامیہ ہو تعلیم کے کل وسائل اس انتظامیہ کے حوالے کئے جائیں اور وزارت خزانہ کی عملداری سے باہر ہوں۔ حکومت بھی اپنا حصہ ادا کرے اور افراد اور معاشی ادارے بھی۔ اس نوعیت کی انتظامیہ کا ایک خاکہ تعلیمی انتظامیہ (باب ششم) میں پیش کیا جائے گا۔ یہ ادارہ ہر سطح پر معاشرہ کے قلبی و مالی تعاون کو آگے بڑھانے کا سبب ہوگا۔

ان تدابیر کے باوجود اگر وسائل پورے نہ ہوں تو پھر فیس کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ فیس کی وصولی کے حق میں یہ کہا جاتا ہے کہ:

۱۔ تعلیم بلا شبہ بنیادی ضرورت ہے اور اس کا انتظام کرنا ریاست کا فرض ہے لیکن جس طرح علاج کے لئے دوا کرہنے کے لئے مکان اور پہننے کے لئے کپڑوں کا معاوضہ ایک عام شہری ادا کرتا ہے۔ اس طرح تعلیم کا معاوضہ ادا کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ تعلیم بالآخر اس کے دینی و اخروی فائدے کے لئے ہے۔ اگر وہ اس پر رقم خرچ کرے تو اس میں کیا حرج ہے۔

۲۔ فیس کی وصولی اس لئے بھی ناگزیر ہے کہ ایک عام ریاست کے وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کے لئے قومی منصوبہ بندی کے تحت جیسا کہ ایک اسلامی ریاست میں مطلوب ہے مناسب اور ضروری تعلیم کا انتظام کر سکے۔ بالفعل ہوتا یہ ہے کہ عدم فیس یا کم فیس فروغ علم میں رکاوٹ بن جاتی ہے اور سرے سے تعلیم کا انتظام ہی نہیں کیا جاتا۔

۳۔ مفت تعلیم، تعلیم کی ناقدری کا سبب بن جاتی ہے۔

فیس کی وصولی کے ضماں یہ کہا جاتا ہے کہ :

۱۔ اس طرح تعلیم کا عُن دراصل ایک کاروبار کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس سے علوم کی تقدیس پر حرج آتا ہے۔ طالب علم کی نظر میں علم کی حرمت و عظمت میں کمی آجاتی ہے اور حصولِ علم پر معاشرہ کے لئے احسانِ مندی کے جذبات کے بجائے یہ سمجھتا ہے کہ میں نے جو کچھ حاصل کیا اور جو نیا وہ اپنے مال اور قوتِ بازو کے بل پر بنا۔

۲۔ انتہائی عسوس طریقے پر یہ عمل معاشرہ کو طبقات میں تقسیم کرتا ہے یا انہیں برقرار رکھتا ہے۔ جو فیس ادا نہیں کر سکتے وہ محرومیِ تعلیم کی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور اپنے کو محروم طبقہ میں سمجھتے ہیں اور معاشرہ سے شامی رہتے ہیں۔

۳۔ کمر فیس کے ذریعے کل اخراجات کا نہایت قلیل حصہ وصول ہوتا ہے۔ اس وقت بھی کل اخراجات وصول نہیں کئے جاتے۔ اگر یہ چند فیصد بھی جو ایک اندازہ کے مطابق ۱۰ فیصد سے زائد نہیں ہوتے بطور فیس وصول نہ کئے جائیں بلکہ دوسرے ذرائع سے حاصل کئے جائیں تو فیس کی قباحت سے بچا جاسکتا ہے۔

ان دلائل کا جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اسلامی تصورات میں علم کے ساتھ ایسا تقدس وابستہ ہے کہ اس کے ساتھ لین دین اور معاوضہ کو ذہن قبول نہیں کرتا۔ جب اپنی تاریخ کے حوالے سے ہم علمی روایت بیان کرتے ہیں تو ایک طرف ان استادوں کا بیان ہوتا ہے جو اثارِ روبرق بانی کی مثالیں قائم کر گئے تو دوسری طرف اس کا کوئی تصور ہی نہیں ملتا کہ طالب علم معاوضے کے طور پر کوئی رقم ادا کرے۔ آج دینی مدارس میں جو ایک لحاظ سے ہمارے روایتی تعلیمی نظام کی نشانی کہے جاسکتے ہیں، طالب علم کی نہ صرف تعلیم بلکہ رہن سہن، خوراک، پوشاک اور روزمرہ ضروریات کی مالی ذمہ داری مدارس کی انتظامیہ کی ہوتی ہے جو وہ معاشرہ کے تعاون ہی سے پورا کرتے ہیں لیکن دوسری طرف عملی مسئلہ یہ ہے کہ تعلیم بالعموم اور اعلیٰ تعلیم بالخصوص اتنی گراں ہو گئی ہے کہ اس کے مصارف پورا کرنے کے لئے ایک مدیر بھی نظر آتی ہے کہ جو طلبہ زیر تعلیم ہیں ان سے کچھ نہ کچھ فیس لی جائے لیکن کیا یہ اسلامی تصور کے منافی ہوگا؟

تعلیم حاصل کرنے پر معاوضہ کی طرح تعلیم دینے پر معاوضہ بھی ابتدائی دور میں موضوعِ زیر بحث رہا۔ فقہانے یہ اجازت دی کہ بقدر ضرورت معاوضہ حاصل کرنے میں مضائقہ نہیں اور آج اساتذہ کے لئے معاشرے

کے ”دوسرے تمام افراد کی طرح باعزت مشاہرے“ اسلامی نظام تعلیم کا جزو قرار دیتے جاتے ہیں۔ اس پر کیا ہم یہ قیاس کریں کہ نفیس بنیادی طور پر پسندیدہ نہ ہی لیکن ممنوع بھی نہیں یا یہ کہ طالب علم جو علم و بہارت حاصل کر رہا ہے اور جس کا فائدہ اس کی ذات کو بھی پہنچے گا اسے اس کا ایک حد تک معاوضہ ادا کرنا ہی چاہیئے۔

نہ صرف اسلامی بلکہ ایک عام خلائی ریاست بھی تعلیم کو بنیادی ضرورت قرار دیتی ہے اور اسے پورا کرنا ریاست کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ اسلامی ریاست کے شہری پر تو حصول علم فرض ہے۔ اس فرائض کی ادائیگی میں وسائل کی کمی آڑے آتی ہو تو ریاست کے لئے زیر تعلیم طلبہ سے بیس لینے کا جواز ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر نفیس کی کراہت پر اصرار ہو تو ایک صورت یہ بھی ہے کہ طالب علم اسے قرض تصور کرے اور بعد میں ادا کر دے۔

اسلامی معاشرہ میں اس تصور کو فروغ دیا جاسکتا ہے اور اس کو عملی شکل دینے کے لئے ادارے قائم کئے جاسکتے ہیں کہ معاشرے نے تعلیم دے کر طالب علم کی خدمت کی ہے اور اپنا فرض ادا کیا ہے اب طالب علم معاشرہ کی خدمت کرے اور اپنا فرض ادا کرے۔ اس معاشرتی خدمت کی کمی اور مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ تعلیم کے فروغ میں حصہ ادا کرے۔ دوران تعلیم اور حصول تعلیم کے بعد بھی ایک مقررہ مدت کے لئے وہ خواندگی عام کرنے کی ہم میں حصہ لے۔

۲۔ مقررہ مدت کے لئے ملٹری سروس میں جائے۔

۳۔ بلدیاتی اداروں کے تحت یا اعتبار کے نظام سے منسلک کر کے معاشرتی خدمت کے ایسے باقاعدہ فعال ادارے بنائے جائیں جو اسلامی معاشرہ کی اخلاقی اقدار کی نگہبانی کریں، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں، بیواؤں اور یتیموں کی دیکھ بھال کریں، شہری ضروریات کی دیکھ بھال کریں وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے اداروں کا ایک مستقل ڈھانچہ ہو اور اس میں ہر طالب علم دوران تعلیم علمی جزو دقتی اور حصول علم سے فراغت کے بعد معینہ مدت کے لئے کل وقتی کام کرے۔

ان تدابیر کے ذریعے اس تصور کو عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ مفت تعلیم فراہم کرے اور طلبہ مفت خدمات انجام دیں۔

درج بالا بحث کی روشنی میں اس مسئلے کے بارے میں اسلامی ریاست کیلئے یہ عملی طور پر پابندی مناسب نظر آتی ہے۔

۱۔ آٹھویں جماعت تک یا میٹرک تک کی معیاری تعلیم لازماً ہر شہری کے لئے غالب علم و طالبہ کے لئے مفت فراہم ہونا چاہیے۔

۲۔ اگر صورت حال یہ ہو کہ اس کے بعد کی تعلیم مفت ہونے کی وجہ سے غیر معیاری ہو رہی ہو یا فراہم ہی نہ ہو پارہی ہو تو فیس کی وصولی کا جواز ہے۔ اس کی حیثیت کسی سوئے یا کاروبار کی نہیں بلکہ ایک معاشرتی عمل میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ہوگی۔

۳۔ لیکن یہ صورت ہرگز نہ ہوگی کہ زیادہ فیس سے بہتر تعلیم اور کم فیس سے کم تر درجہ کی تعلیم ملے۔

۴۔ ایک ہی جیسی تعلیم کے لئے مختلف افراد سے ان کی استطاعت کے مطابق کم یا زیادہ یا صفر فیس وصول کی جائے۔ اس کے لئے والدین کی آمدنی اور اولاد کی تعداد کے لحاظ سے مناسب فارمولہ بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس تصور کو تقویت ملے گی کہ افراد اپنی استطاعت کے مطابق تعلیمی کوششوں میں اپنا حصہ بٹا رہے ہیں۔

فیس کے جواز کے لئے بنیادی نقطہ نظر ہے کہ ہر شہری کے لئے مناسب تعلیم کی فراہمی اصل بات ہے اور کسی اسلامی حکومت کے لئے جواز نہیں ہے کہ وہ وسائل کی کمی کی بنیاد پر اس سے پہلو تہی کرے۔ اسی طرح شہریوں کا فریضہ ہے کہ جب وہ حکومت سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کے لئے تعلیم کا انتظام کرے تو اس کا بار اٹھانے میں اس کا ساتھ دیں۔

۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی "تعلیمات" اور "دینی مدارس کا نظام تعلیم" (جلد ۵ : ۵) انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد۔

۲۔ مسلم سجاد، سلیم منصور خالد، "تعلیم اور نجی شعبہ" (جلد ۷ : ۷)، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز،

۳۔ ایضاً - "کیاں نظام تعلیم" (جلد ۴ : ۴)، "تعلیم اور نجی شعبہ" (جلد ۷ : ۷) اور "پاکستان میں

ذریعہ تعلیم کا مسئلہ" (جلد ۹ : ۹) انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد۔

۴۔ ایضاً --- "ہمارے تعلیمی نظام میں ضیاع" (جلد ۱۲ : ۱۲) انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز،

نظام تعلیم : بنیادی عناصر



کسی بھی نظریاتی ریاست میں تعلیمی ادارے بنیادی طور پر ایک ہی نظم سے منسلک باہم مربوط اور ایک ہی لڑی میں پڑتے ہوئے ہونے چاہئیں۔ یہ ادارے نہ صرف ملک کی ہر طرح کی متنوع ضروریات کو پورا کرنے والے ہونا چاہئیں بلکہ فرد کی زندگی میں اس نظریہ کا جو کچھ تقاضا ہے انہیں اسے بھی پورا کرنا چاہیے۔ مختلف ضمنی موضوعات کے تحت ان اداروں کے بنیادی اور تشکیلی عناصر پر اس حصہ میں بحث کی جائے گی۔ یہاں ان اداروں کے کسی ملک میں بحیثیت مجموعی پورے نظام (Structure) پر مختصر گفتگو ہوگی۔

اسلامی نقطہ نظر سے اس نظام کا سب سے زیادہ ممتاز اور منفرد پہلو یہ ہوگا کہ طالبات کے لئے ہر سطح کے علیحدہ تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ بعض مسلم ممالک میں طالبات کے لئے علیحدہ تعلیمی ادارے بھی کام کرتے ہیں لیکن مطلوب یہ ہے کہ ابتدائی تین سال کی تعلیم (یعنی تقریباً ۸ سال کی عمر) کے بعد کسی سطح اور کسی مرحلہ پر بھی مخلوط تعلیم کی اجازت نہ ہو۔

اسلامی نظام تعلیم کے تعلیمی اداروں کے بارے میں یہ وہ رہنمائی ہے جو ہمیں شریعت سے حاصل ہوتی ہے لیکن تعلیمی اداروں کے بارے میں پرائمری، ثانوی، اعلیٰ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مراحل کا تعین وہ دائرہ ہے جس میں کوئی ملک اپنے حالات اور مقتضیات کے لحاظ سے فیصلہ کر سکتا ہے۔ کسی خاص دور میں ایک نظام برسر عمل ہو، اور خیر ممالک کچھ تبدیلی کے بعد سے اختیار کر لیں تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ طالب علم کی نفسیات عمر کے مختلف مراحل میں نفسیاتی و جذباتی تقاضے اور دینی قومی ضروریات وہ عوامل ہیں جو اس بنیادی ڈھانچہ کی تفصیلات طے کرنے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی خاص مہیت کے بارے میں نہ کوئی قطعی حکم لگایا جاسکتا ہے اور نہ کوئی قدرغن عائد کی جاسکتی ہے۔ جدید مسلم معاشرہ کی ضروریات اور اداروں

کے باہم ربط کے نقطہ نظر سے ایک خاکہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

۱- پہلے تین سال کی تعلیم (۸ سال کی عمر تک) طلبہ و طالبات کو مشترک اداروں میں دی جاسکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مساجد سے کام لیا جائے۔ جہاں ضرورت ہو، نئی مساجد تعمیر کر دی جائیں۔ مساجد کے ائمہ کو (ضرورت ہو تو تربیت دے کر) ان اداروں کا نگران بنایا جائے۔ مساجد میں تعلیم کا انتظام بے شمار خوشگوار پہلو رکھتا ہے جس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ابتدائی تعلیم و تربیت دینی پس منظر میں ہوتی ہے۔

۲- اگلے ۵ سال کی تعلیم (۱۳ سال کی عمر تک) کے لئے طلبہ و طالبات کے علیحدہ ادارے اور مناسب عمارات ناگزیر ہیں۔ یہ آٹھ سال کی تعلیم لازمی ہونا چاہیئے اور انتظام اور سہولت اتنی ہونی چاہیئے کہ ضروریات کو پورا کرے۔ یہ سب ادارے یکساں معیار کے ہونا چاہیئے۔ قانون کے تحت اس تعلیم کا حصول لازمی قرار دیا جانا چاہیئے۔

۳- اگلے دو سال کی تعلیم (۱۵ سال کی عمر تک) میں یہ لحاظ رکھا جائے کہ طالب علم کو کوئی نہ کوئی ایسا ہنر سکھایا جائے کہ اگر وہ چاہے تو اس کے بعد مزید تعلیم کے بغیر اپنی عملی زندگی کا آغاز کر دے۔

۴- اس کے بعد دو سال کی تعلیم (۱۷ سال کی عمر تک) دراصل آئندہ تعلیم کے لئے بنیاد فراہم کرنے اور عمومی سطح بلند کرنے کے لئے ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد چار یا پانچ سال (۲۱/۲۲ سال تک) کی تعلیم طالب علم کو کسی مخصوص ملی و قومی ضرورت پوری کرنے کے لئے تیار کرے۔ طالب علم کو صلاحیت و اہلیت کی بنیاد پر اعلیٰ کے ان اداروں میں داخلہ ملے۔ اور اسلامی علوم، فطری علوم، طبعی علوم، عکری علوم، انتظام، مملکت، قانون، طب، انجینئری، زراعت اور دیگر شعبوں میں اختصاص اور ہمیشہ وراثہ ہارت رکھنے والے افراد کا اسلامی ریاست کو فراہم ہو سکیں۔

۵- اختصاصی تعلیم کے بعد مختلف میدانوں میں تحقیقاتی ادارے ہو سکتے ہیں جو جامعات سے ملحق بھی ہو سکتے ہیں اور علیحدہ بھی۔ ان کی منصوبہ بندی میں ملی و قومی ضروریات دونوں

کو اہمیت دی جائے گی۔

ان تعلیمی اداروں کے سرکاری ہونے کی شرط نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ اسلامی ریاست کے مقرر کردہ معیارات پر پورے اُتریں۔ مختلف سطح کے لئے ان اداروں کی نصابی ضروریات کے بارے میں گفتگو نصاب کے عنوان کے تحت کی جائے گی۔

ان اداروں میں جو تعلیمی نظام برسرکار ہوگا، اس کے بنیادی عناصر نام کی حد تک موجودہ دور کے عناصر سے مختلف ہوں گے یعنی استاد، کتاب، نصاب وغیرہ، لیکن اپنی اہمیت، نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے یہ ایک بالکل نیا نظام تشکیل دیں گے ان عناصر پر درج ذیل عنوانات کے تحت بحث کی جائے گی۔

۱۔ استاد

۲۔ طالب علم

۳۔ نصاب

۴۔ کتاب و تدریسی آلات

۵۔ ہم نصابی سرگرمیاں

۶۔ حکومت اور تعلیمی انتظامیہ

۷۔ معاشرہ

۱۔ استاد

تعلیم کے کسی بھی نظام میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ مقاصد تعلیم کے حصول میں اس کا کردار بنیادی ہوتا ہے۔ کاغذ پر بنائے گئے تمام منصوبوں کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار استاد کے تعاون یا عدم تعاون پر ہوتا ہے۔ اس لئے فنِ تدریس کی تمام کُتب استاد کے منصب و مقام کی اہمیت کو بیان کرتی ہیں اور جدید دور کا ہر نظام تعلیم استاد کی اپنی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کرتا ہے۔ تعلیم کی اسلامی روایت میں استاد کو نہایت مؤثر اور مثبت مقام حاصل ہے۔ اس پیشہ کی تقدیس کا احساس اس سے ہوتا ہے کہ دراصل یہ خود انبیاء کا کام ہے۔

وہ بنیادی طور پر انسان کو علم عطا کرنے ہی آنے تھے۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انما بعثت معلما ”بلاشبہ مجھے استاد بنا کر بھیجا گیا ہے۔“ اس لئے استاد کے فرائض کا شعور حاصل کرنے اور طریقہ تدریس میں راہنمائی حاصل کرنے کے لئے اسوۂ حسنہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ مطالعہ ہمارے سامنے ایک مثالی استاد کی تمام خصوصیات نہایت جزئی تفصیلات سے لاتا ہے۔

۱۔ مسلم تعلیمی روایت میں استاد کا مقام

مسلم تعلیمی تاریخ میں استاد کی امتیازی شان یہ رہی ہے کہ وہ محض علم و فضل میں ہی نہیں بلکہ تقویٰ و کردار میں بھی اعلیٰ مقام کا حامل رہا ہے۔ مسلم معاشرہ نے عالم بے عمل کو کبھی تسلیم نہیں کیا ہے۔ کردار کی اہمیت بنیادی رہی ہے۔ مسلم مفکرین تعلیم نے استاد کی جو صفات بیان کی ہیں۔ ان میں اعلیٰ کردار، تقویٰ و خدا ترسی اور قول و فعل کی ہم آہنگی کو نمایاں مقام دیا ہے۔

اس تعلیمی روایت میں استاد کو اتنا مرکزی مقام حاصل تھا کہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم کا پورا مزاج استاد کا بنایا ہوا تھا۔ نصاب کی تشکیل بھی اسی کا کام تھا۔ صاحب حیثیت ہوتا تو طلبہ کی کفالت کی ذمہ داری بھی اٹھاتا تھا۔

طالب علم جس استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتا اسی سے تکمیل علم کرتا پھر دوسرے استاد کے پاس جاتا۔ بیک وقت دس دس اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا رواج نہ تھا۔ جس استاد کی شاگردی میں ہوتا اس کی اطاعت و خدمت کو بھی فرض جانتا۔

استاد کی حیثیت آج کے مفہوم میں محض استاد کی نہ تھی بلکہ مربی اور مرجع کی تھی۔ استاد طالب علم کے اخلاق و کردار پر بھی نظر رکھتا اور اس کی معاشی ضروریات اور گھریلو حالات کی بھی اسے فکر ہوتی تھی۔ حکومت اور استاد کے باہمی تعلقات میں استاد کا مقام برتر تھا۔ خلفاء اور عمال حکومت اساتذہ کی عزت اور احترام کرتے تھے اور ان کے معاملات میں مداخلت سے باز رہتے تھے۔ معاشرہ میں انہیں اعلیٰ اور معزز مقام حاصل تھا۔ عوام الناس ان کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ ان کو اپنا راہنما مانتے تھے۔ ان کا اثر و رسوخ صرف درس گاہوں تک محدود نہ تھا بلکہ گلی کوچوں تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ تمام معاشرتی سرگرمیوں میں فعال حصہ لیتے تھے۔

۲۔ مغربی تعلیمی روایت میں استاد کا مقام

لیکن مغربی نظامِ تعلیم نے یہ سب روایات الٹ کر رکھ دیں۔ مسلم ممالک کو جو نظامِ تعلیم و درغلامی سے ورثہ میں ملا۔ اور آج بھی مقاصد، نتائج اور خصوصیات کے لحاظ سے تقریباً وہی زیرِ عمل ہے۔ اس میں استاد کو جو مقام حاصل ہے اسے ہم ان خصوصیات کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔

۱۔ دین و دنیا کی علیحدگی کے تصور کے تحت، استاد کے کردار میں تقویٰ اور خوفِ خدا کا کوئی مقام نہ رہا۔ عام انسانی اخلاقیات کے تحت اچھے بُرے استاد کا تصور تو ایک حد تک ہے لیکن دینی تصورات کے تحت اخلاقی اقدار کو کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔

۲۔ استاد اپنا فریضہ محض علم کی منتقلی کو سمجھتا ہے۔ طالب علم کی سیرت و کردار کی فکر اپنے فرائض کے دائرہ میں شامل نہیں سمجھتا۔

۳۔ طالب علم سے اس کا تعلق محض کلاس روم تک محدود ہے۔ کلاس روم سے باہر تعلیمی ادارہ کی حدود کے اندر ہی سہی، وہ طالب علم کی سرگرمیوں کا نہ اپنے کو ذمہ دار سمجھتا ہے، نہ اس پر نظر رکھتا ہے۔ تعلیمی ادارہ سے باہر کے طرزِ عمل کے زیرِ بحث آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ طالب علم ہی اسے کلاس روم سے باہر استاد کا سا مقام دیتا ہے۔

۴۔ تعلیمی اداروں کے نظم و نسق سے وہ تقریباً بے تعلق ہے۔ اسی طرح تعلیم کے مقاصد کے تعین، تعلیمی حکمتِ عملی، تعلیم کی منصوبہ بندی وغیرہ کے معاملات میں اس کی کوئی آواز نہیں ہے۔

۵۔ اس کی حیثیت ایک ماتحت ملازم کی ہے۔ تعلیمی انتظامیہ کے افسران اس سے ملازم کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ تنخواہ یافتہ ہونے سے لازم نہیں آتا کہ برتاؤ بھی ملازموں جیسا کیا جائے۔ لیکن عملاً ایسا ہی ہوتا ہے۔

۶۔ معاشرہ میں اعلیٰ مقام حاصل نہیں۔ معاشرتی اقدار کی تبدیلی نے عزت و احترام کو بڑی حد تک دولت و ثروت سے مربوط کر دیا ہے۔ چونکہ مالی لحاظ سے اساتذہ تنگدست ہیں، اس لئے توقیر کے مستحق بھی نہیں ٹھہرتے۔

۷۔ تدریس کا معاوضہ وصول کرنا اور مناسب معاوضہ وصول کرنا بری بات نہیں ہے لیکن
مطلحہ نظر یہی ہو جانا اور اس کے کم ہونے کی بنیاد پر فرائض سے غفلت کا جواز تلاش کرنا
مناسب نہیں لیکن اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، یہ صورت حال موجود ہے۔

استثنائی صورتوں سے قطع نظر یہ عمومی صورت حال ہے جس سے تعلیمی منظر کا کوئی طالب علم شاید ہی انکار
کرے۔

اس پس منظر میں ہمیں اس مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ اگر آج کوئی ریاست اسلامی نظام تعلیم نافذ کرے
تو وہ اس میں استاد کو کیا مقام دے گی اور اسے کس طرح حاصل کرے گی۔

جدید اسلامی معاشرہ میں استاد کا مقام

پہلے قدم پر ہی ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ آج کسی معاشرہ کے تعلیمی عمل میں استاد کی ذات و شخصیت
کو وہ مرکزی مقام حاصل نہیں ہو سکتا جس کا ذکر ہم اپنی تاریخ اور روایت کے حوالہ سے کرتے ہیں۔ ایک
زمانہ تھا کہ کتاب بھی نہ تھی اور استاد کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہی سب کچھ تھے۔ پھر کتاب اور نصاب
کے رواج نے استاد کی حیثیت پر اثر ڈالا۔ کتاب کی تفہیم کے لئے استاد کی احتیاج تو باقی رہی اور اب بھی ہے
لیکن یہ ممکن ہو گیا کہ کوئی کسی زندہ وجود کو درمیان میں لاتے بغیر بھی حصول علم کر لے۔ تعلیمی اداروں کے نظم و نسق
کے باقاعدہ ادارے قائم ہونے سے اور تعلیم کے عمل میں ریاست کے موثر عمل دخل سے بھی استاد کی حیثیت
پر اثر پڑا۔ جدید ٹیکنالوجی نے تعلیم و تلمیم کے ایسے ذرائع ہبیا کر دیئے ہیں جہاں کسی چلتی پھرتی شخصیت کے
کردار کو نمونہ بناتے بغیر بھی ہر طرح کے علم کا حصول ممکن ہے۔ خط و کتابت، ٹی وی اور ریڈیو
کے ذریعے تعلیمی اسباق اور اب پرنسپل کمپیوٹرز اس کی مثال ہیں۔ یہ تو رسمی تعلیم کی بات ہے، غیر رسمی
تعلیم کا پورے نظام تعلیم کی کردار سازی کے عمل اور خصوصاً استاد کی انٹر اگیزی سے جو تعلق ہے۔ اس
سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

اپنے نظریہ حیات کی روشنی میں کسی نئے نظام تعلیم میں استاد کو کوئی مقام دینے، اس کے فرائض و
حقوق کا تین کرنے اور اس سے توقعات قائم کرنے میں ہمیں اس عملی صورت حال سے آنکھیں بند نہیں
کرنا چاہیے۔ اس بحث کے دوران یہ دونوں کات ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہوں۔

۱۔ استاد کے منصب و مقام میں تبدیلی، نظام تعلیم کے دوسرے عناصر اور نظام حیات میں تبدیلی کے ساتھ ہی آئے گی۔

۲۔ کوئی بھی عملی صورت حال، اس حقیقت کو نہیں مٹا سکتی کہ درس دینے والا استاد،

درس لینے والے طالب علم کیلئے نمونہ عمل ہو رہا ہے۔ * ۳

اسلامی نظام تعلیم میں استاد کے منصب و مقام کو سمجھنے کے لئے ہم دو عنوانات کے تحت مطالعہ کریں گے:

۱۔ استاد سے اسلامی معاشرہ کی توقعات

۲۔ استاد کی اسلامی معاشرہ سے توقعات

۱۔ استاد سے اسلامی معاشرہ کی توقعات

ایک اسلامی معاشرہ اپنی نئی نسل کو استاد کے حوالے کرتا ہے اور اس سے کچھ توقعات قائم کرتا ہے۔ وہ کیا ہیں؟

آ۔ استاد صاحب ایمان و تقویٰ ہو۔ یہ بنیادی وصف اسلامی نظام تعلیم کے رکن ہر استاد میں ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر ہم دوسری کسی توقع کے پوری ہونے کا سوچ نہیں سکتے۔ اس سے اس کی شخصیت میں وہ جوہر پیدا ہوگا جو اس کے طلبہ میں منعکس ہوگا اور نظام تعلیم کے حقیقی مقاصد حاصل ہو سکیں گے۔

۲۔ استاد صاحب علم ہو۔ ہر استاد، خواہ وہ کسی بھی مضمون کا ہو، دین کا بنیادی ضروری علم رکھتا ہو اور اپنے مضمون کا اتنا علم رکھتا ہو کہ متعلقہ سطح کے طلبہ کی تدریس بحسن و خوبی کر سکے۔ اس کا علمی معیار بلند ہو اور مطالعہ کی عادت ہو کہ احوال دنیا سے بھی واقف رہے

* آج بھی جو اس کا قابلیت رکھتا ہو، دیا ندراری سے فرائض انجام دینے وقت پر آئے، نفعِ وقت نہ کرے، حکم سے اور خاص طور پر طلبہ سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ اگر وہ بندوں کی سیاست میں نہ پڑے نہ شائستگی کے معیار سے نیچے نہ جائے تو آہستہ آہستہ وہ طلبہ میں عزت بھی پالیتا ہے اور ان کا آئیڈیل بھی بن جاتا ہے۔ استاد صرف پڑھانے والی مشین نہیں وہ اثر لینے اور اثر ڈالنے والا انسان ہے۔

اور اپنے مضمون میں نوبت تحقیقات سے بھی آشنا رہے۔

۳۔ وہ اپنے طلبہ کی علمی یاقوت، علمی تربیت اور سیرت و کردار کی نگہداشت کو اپنے فرائض میں سمجھے اور اپنے کو ان کا مسئول سمجھے اور جانے کہ اسے ان کے بارے میں جوابدہی کرنا ہے۔ طلبہ اس کے پاس معاشرہ کی امانت ہیں اور اسے ایک امین کی طرح ان کے بارے میں اپنے فرائض خیانت سے دامن بچاتے ہوئے ادا کرنا ہیں۔ اسے ہم نصابی سرگرمیوں میں مثبت حصہ لینا چاہیے۔

۴۔ اسے معاشرہ کا ایک سرگرم اور فعال رکن ہونا چاہیے۔ اس کا وزن خیر کے پڑے میں پڑے۔ چھوٹے قصبات اور دیہات میں تو اسے مرکزی شخصیت ہونا چاہیے۔ لوگ اسے اپنے سے زیادہ جاننے والا، اپنا خیر خواہ، ہمدرد اور اپنے بچوں کا نگہبان تصور کریں۔ بڑے شہروں میں بھی اس کی علمی برتری اور عظمت کردار اس کے لئے اعلیٰ مقام کی ضمانت ہو۔ وہ اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لینے والا اور ان میں مثبت کردار ادا کرنے والا ہو۔

۵۔ اُسے فن تدریس سے واقف ہونا چاہیے۔ بلاشبہ کچھ لوگوں میں تدریس کا قدرتی ملکہ ہوتا ہے لیکن فی زمانہ یہ ایک ایسا فن ہے جسے دلچسپی لے کر سیکھا جاسکتا ہے اور اس سلسلے میں علمی تربیت کے ذریعے جدید ترین فرائض کے استعمال سے بھی آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

یہ توقعات ہیں جو ایک استاد سے اسلامی معاشرہ کرتا ہے، دوسرے الفاظ میں، یہ اس کے فرائض منضبی ہیں لیکن وہ کیا توقعات ہیں جو ایک استاد اسلامی معاشرہ سے کرتا ہے یعنی اس کے وہ حقوق کیا ہیں جنہیں ایک اسلامی نظام تعلیم میں لازماً ادا کیا جانا چاہیے؟

۲۔ استاد کی اسلامی معاشرہ سے توقعات

۱۔ حقوق میں پہلا اور سرفہرست یہ ہے کہ معاشرہ اسے عزت و احترام کا مقام دے۔ قدیم یونان اور چین میں استاد کی گویا پوجا ہوتی تھی۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد سے استاد مغربی معاشروں میں بھی بڑی قدر و منزلت کا حامل رہا ہے۔ مسلم معاشرہ کی روایت بھی

یہی ہے کہ استاد کو عزت و احترام کا مقام ملے لیکن یہ مقام محض نیک تمناؤں اور خواہشوں سے نہیں ملے گا بلکہ ایک اسلامی حکومت کو جدید معاشرتی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں کہ استاد اپنے حقیقی مقام پر فائز ہو۔ وہ نہ صرف خود اپنی نگاہ میں معزز و محترم ہو اور اپنے پیشے کو قابلِ تکریم سمجھتا ہو بلکہ طلبہ بھی اس کا احترام کرتے ہوں، انتظامیہ بھی اس کے مرتبہ کو واقعتاً تسلیم کرتی ہو اور بحیثیت ایک پالیسی، حکومت معاشرہ کی اسلامی تشکیل میں ان کے کردار کی اہمیت کو ملحوظ خاطر رکھتی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرے کے تمام طبقات استاد کا احترام کریں گے اور نئی نسل کے ذہن عناصر اور کچھ کرنے کا جذبہ و عزم رکھنے والے طلبہ فخر کے احساسات کے ساتھ تدریس کو اپنی زندگی کے پیشے کے طور پر اختیار کریں گے۔

۲۔ استاد کا دوسرا حق یہ ہے کہ معاشرہ نے جو کام اس کے سپرد کیا ہے، یعنی نئی نسل کی اسلامی نظریہ حیات کے تقاضوں کے مطابق تعلیم و تربیت، اس میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔ یہ بوالعجبی ہی ہوگی کہ استاد کو تو یہ فرض سوچا جائے کہ طلبہ کو اسلامی سیرت و کردار کے سانچے میں ڈھالے اور پھر معاشرہ پوری قوت و طاقت سے یہ کام کرے کہ طلبہ اسلامی سیرت و کردار کے سانچے میں نہ ڈھیلیں۔ اس کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہوگا کہ نظام تعلیم اس طرح تشکیل دیا جائے کہ نصابات، دوسری کتب، ہم نصابی سرگرمیاں اور نظام کے دوسرے عناصر اس میں مدد ہوں بلکہ خود معاشرہ میں بھی اسلامی اقدار کا چلن ہو اور انہیں برتری حاصل ہو، بالخصوص ریاست کے وہ شعبے جو انسانی ذہن و کردار کو متاثر کرتے ہیں یعنی ذرائع ابلاغ، استاد کے معاون کا کردار ادا کریں۔

۳۔ معاشرہ پر یہ بھی استاد کا حق ہے کہ اس کے معادضے اور سہولتیں دوسرے پیشوں میں کام کرنے والے مساوی قابلیت کے افراد سے نہ صرف یہ کہ کم نہ ہوں بلکہ زیادہ ہوں۔ بلاشبہ ہم استاد سے یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ دنیا پر حریف ہوں، لیکن اسلامی معاشرہ کو تاہی کا مجرم ہوگا اگر وہ استاد کو قرار واقعی مشاہرے اور سہولتیں نہ دے اور

اس سے فرائض کی مثالی انجام دہی کی توقع کرے۔ ہماری تاریخ میں ایسے علمامہ و اساتذہ کی ان گنت مثالیں ہیں جنہوں نے ایشاد و قربانی کی مثالیں قائم کی ہیں اور مدرسے کے معاوضے قبول کرنے سے انکار کیا ہے یا انتہائی کم معاوضوں پر کام کیا ہے، لیکن کسی ملک کا نظام تعلیم ان چند مثالوں کو بنیاد بنا کر وضع نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کی تعلیمی ڈایت میں تنخواہوں کا نظام بھی موجود رہے۔ ہمیں اس دور میں اس کو اپنانا چاہیے۔ دنیا کی سہولتیں اور آسائشیں فی نفسہ بری نہیں اور جب کسی اسلامی معاشرہ میں دوسرے پیشوں سے وابستہ افراد اس کا حق رکھتے ہیں۔

تو استاد کو اس سے مستثنیٰ سمجھنے کا کیا جواز ہے؟ جب ایک اسلامی معاشرہ اس حقیقت کو تسلیم کرے گا تب ہی وہ استاد کو سس کا جائز مقام دے گا؟ *

۴۔ اساتذہ کو انجمن سازی کا حق ہو گا تا کہ وہ نظام تعلیم کو اسلامی خطوط پر چلانے اور اس کو بہتر بنانے میں تعاون کے ساتھ ساتھ، اپنے معاشی و دیگر حقوق کے لئے مروجہ طریقوں کے مطابق اپنی اجتماعی قوت سے جدوجہد کر سکیں۔ اساتذہ کی انجمنیں کوئی جدید تصور نہیں۔ قرون وسطیٰ کے مسلمان تنظیم کرنا جانتے تھے۔ انہوں نے تحفظ حقوق کی انجمنیں بنائی تھیں جو نقابات کہلاتی تھیں..... اساتذہ کی بھی انجمن تھی جس کے فرائض میں تھا کہ اساتذہ کے درجے اور حیثیت کو بلند رکھے اور تعلیمی معاملات کی بھی دانشمندی سے نگرانی کرے۔ اساتذہ انجمن نہایت کامیابی سے چلتی تھی اور اکثر اوقات تعلیمی معاملات میں اس کا دخل خلیفہ کے احکامات سے بھی بڑھ کر ہوتا تھا۔ ان نظائر کے ہوتے ہوئے کسی اسلامی معاشرے میں انجمن سازی کو نا پسندیدہ قرار دینا صحیح فکر کا اظہار نہ ہو گا۔ ریاست کتنی ہی مثالی کیوں نہ ہو اور اساتذہ کے مقام سے

* ان کو اپنی قابلیت کے مطابق معاشرے، خصوصی الاؤنس اور دیگر فوائد ملنا چاہئیں۔ انہیں مطمئن رکھنے کے لئے دوسرے دایعہ مثلاً ترقی اور قاعدے کے مطابق آگے بڑھنے کے لئے پالیسی ہونا چاہیئے (مکہ کانفرنس کی اساتذہ کی تعلیم پر کمیٹی کی ۶ کی سفارشات)

آگاہ ہی کیوں نہ ہو تب بھی یہ عملی دنیا کی ضرورت ہے کہ اساتذہ اپنا مرتبہ و مقام حکومت اور معاشرہ کو فراموش نہ کرنے دیں اور کوشش کریں کہ بیان کردہ پالیسیوں کے مطابق عملی اقدامات بھی کئے جائیں

اسلامی نظام تعلیم میں استاد کے مرتبہ و مقام کو متعین کرنے کے لئے درج بالا نکات کے علاوہ یہ امور بھی پیش نظر رہنا چاہئیں۔

اساتذہ اور طلبہ

اساتذہ اور طلبہ کا باہمی رشتہ نہایت نازک اور حساس رشتہ ہے۔ استاد کی حیثیت روحانی باپ کی ہے۔ اسلام کی تعلیمی تاریخ میں طلبہ کی جانب سے عزت و احترام اور خدمت اور اساتذہ کی جانب سے محبت و شفقت خیر خواہی اور دل سندی کی نہایت جاندار روایت ملتی ہے۔ جدید دور میں نئے تقاضوں کے تحت اور نظام تعلیم میں بگاڑ پیدا ہونے کے سبب یہ رشتہ بھی مجروح ہوا ہے۔ نظام تعلیم کی اسلامی خطوط پر تشکیل اس رشتہ کو از سر نو زندہ کرنے کا باعث بنے گی، استاد کو بھی اس کی فکر ہوگی کہ وہ اپنے شاگرد سے بے تعلقی کا رویہ نہ رکھے بلکہ اس کے برے بھلے کی ذمہ داری محسوس کرے اور شاگرد بھی استاد کے ادب و احترام میں کمی نہ کرے۔ استاد کے مرنے کی توقع کے تصور کا احیاء ہونا چاہئے۔ اس کے لئے یہ تدبیر کی جاسکتی ہے کہ تعلیمی اداروں میں ایسے نظام اپنائے جائیں کہ طلبہ کی ایک تعداد کلاس روم سے قطع نظر استاد کے سپرد ہو اور وہ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما میں فعال حصہ ادا کرے۔ اسلام کے تعلیمی نظام میں منجملہ دیگر امور کے اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ

- ۱۔ طلبہ سے برتاؤ میں عدل و مساوات کو ملحوظ رکھے۔ کسی پر زیادتی یا کسی کے ساتھ تفریحی سلوک نہ کرے۔ سب کو ایک نظر سے دیکھے ۱

- ۲۔ سزا دینے میں محتاط ہو۔ غیظ و غضب، ڈانٹ پھٹکار طعن و تشنیع سے کام لینے کے بجائے طلبہ کے جذبات اور ان کی عزت نفس کا خیال رکھے اور ٹھنڈے ذل سے ان کی مشکلات کو سمجھے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرے۔ ۲

- ۳۔ طلبہ کے سوالات و اعتراضات پر چڑھنے یا ہانک بھونک سیکڑنے کے بجائے خندہ پیشانی

سے جواب دے کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ ۴

۴۔ لب و لہجہ شیریں ہو، تلخ باتوں کو بھی گوارا کر لے۔ ۵

۵۔ ہر طالب علم کو ذاتی توجہ دے اس کے مسائل میں دلچسپی لئے طالب علم محسوس کرے کہ اس کے استاد کو اس کی فکر ہے۔

اساتذہ اور تعلیمی انتظامیہ

تعلیم کے نظام کے قیام کے نتیجے میں تعلیمی انتظامیہ درجہ میں آتی ہے اور اس کی توسیع اور تنظیم کے ساتھ یہ انتظامیہ وسیع اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ اب بہر حال یہ وہ زمانہ نہیں جب ایک استاد کا اپنا مدرسہ ہو، وہ خود ہی اس کا نصاب ہو، اس میں داخلے اور نظم و ضبط کا فیس و اخراجات کا اور دیگر امور کا ذمہ دار ہو۔ یعنی خود ہی اس کی تعلیمی انتظامیہ ہو۔

تعلیمی انتظامیہ کا ایک پہلو اداروں کے انتظام و انصرام، مستقبل کی منصوبہ بندی، وسائل کا تعین اور خرچہ پر نظر، دوسرا نصاب سازی، درسی کتب کی تیاری اور تیسرا اساتذہ کا تقرر، ملازمت کے لئے قواعد و ضوابط کا تعین، کارکردگی پر نظر رکھنے، ترقی، تنزل اور برطرفی وغیرہ کا نظام ہے۔ یہاں ہمارا موضوع صرف تیسرا پہلو ہے۔

موجودہ صورت حال اس لحاظ سے غور و فکر کا موضوع ہے کہ معاشرہ میں اساتذہ کو ان کا جائزہ مقام حاصل نہ ہونے کی وجہ سے اور انتظامیہ کو وسیع اختیارات حاصل ہونے کی وجہ سے انتظامیہ کا سلوک اساتذہ کے ساتھ ماتحت ملازموں کی طرح کا ہوتا ہے ناجائز کام نہ کرنے پر انتقام لئے جاتے ہیں تبادرے کو دیتے جاتے ہیں اس کی وجہ سے اساتذہ کے مقام و مرتبہ میں مزید کمی واقع ہوتی ہے۔

اس مطالعہ میں اس کے بارے میں تفصیلی تجاویز پیش کرنا پیش نظر نہیں ہے لیکن اس وجہ سے کہ یہ مسلم ممالک کا اعلیٰ مسئلہ بھی ہے اور اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل میں اس سے لازماً واسطہ پیش آنا ہے۔ اس بارے میں یہ اصولی بات عرض کی جاتی ہے کہ باوجودیکہ استاد کا تقرر کیا جائے گا، اس کی کارکردگی پر نظر رکھی جائے گی، کسی اعلیٰ تر ادارہ کو اس کی برطرفی تک کا اختیار ہوگا، استاد تنخواہ بھی لیگا اور ترقی بھی حاصل کرے گا۔ انتظامیہ کا اس سے برتاؤ باعزت ہونا چاہیے۔ یہ مسئلہ دراصل روایات کا ہے۔

اس وقت روایات بگڑی ہوئی ہیں۔ اسلامی نظام اس بارے میں درست روایات قائم کرے گا اور اس میں ذمہ داری ایک طرف خود استاد کی ہوگی کہ وہ اپنے مقام سے فروتر ہو کر معاملہ نہ کرے اور دوسری طرف حکومت کی کردہ نظر رکھے کہ اس کے عمال اساتذہ کی نوہن کے مرتکب ہوں تو ان کو چھوڑ نہ دیا جائے۔

اساتذہ اور سرپرست

اساتذہ کے تعلقات کا ایک دائرہ زیر تعلیم طلبہ کے سرپرستوں سے متعلق ہے، والدین و سرپرست اساتذہ سے بہت توقعات رکھتے ہیں لیکن یہ اس صورت میں پوری ہو سکتی ہیں جب وہ اپنے بچے کے استاد سے ذاتی رابطہ رکھیں۔ استاد کو بھی یہ اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ رابطہ قائم ہو اور قائم رہے۔ ایک ہی معاذرہ کے افراد ہونے اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے مشترک مفاد کی وجہ سے ان کا یہ تعلق زندہ مثبت اور نتیجہ خیز ہونا چاہیے۔

حکمتِ عملی

اسلامی نظام تعلیم میں استاد کو اس کا حقیقی اور مؤثر مقام دینے کے لئے دو نکاتی حکمت عملی پر عمل کیا جائے گا۔ پہلا نکتہ اس کی ملازمت کے نظام سے متعلق ہے اور دوسرا نکتہ اس کی تربیت کے نظام سے متعلق ہے۔

ملازمت کا نظام

مقاصدِ تعلیم کو کامیابی سے حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کی ملازمت کا ایسا نظام وضع کیا جانا چاہیے، جو ایک اسلامی ریاست کے نظامِ تعلیم سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس کی خصوصیات یہ ہوں گی:-

- ۱۔ تقرر و انتخاب کے موقع پر اسناد اور قابلیت کے ساتھ ساتھ دین کے بنیادی علم، ذاتی کردار، میلانِ طبع اور ملک و ملت کے مسائل سے آگہی پر بھی نظر رکھی جائے۔
- ۲۔ کسی بھی دوسرے پیشے کی طرح اس میں بھی برقرار رہنے کے لئے فرائض کی ادائیگی اور دیگر معیارات پر پورا اترنا ضروری ہو۔

۳۔ نرقی اور آگے بڑھنے کے لئے نگرانی اور پرکھ کا معیار ان اجزاء پر مشتمل ہو۔

الف۔ طلبہ کی تعلیم و تربیت میں اس کی حقیقی کارکردگی۔

ب - اپنی صلاحیت اور معیار بہتر کرنے کی اس کی کاوشیں -

ج - معاشرہ کی خدمات

د - تحقیقاتی کام اور مقالات کی تسنیع

۴ ان معیارات پر پرکھنے کے لئے معقول اور معروضی ضابطے اور طریقے وضع کئے جائیں اور ایسا نظام تشکیل دیا جائے کہ اپنے عمل کے نتیجے میں اچھے استاد کو اعلیٰ ترین مقام و منصب کا راستہ کھلائے۔

۵ پرکھ کے نظام میں اور ترقی و ترقی کے فیصلے میں ساتھی اساتذہ اور معاشرے کو شریک کرنے پر غور کیا جاسکتا ہے۔

۶ - ملازمت کا ڈھانچہ ایسا ہونا چاہیے کہ فرائض کی ادائیگی اور صلاحیت و قابلیت کی بنیاد پر ایک استاد کو بہتر سے بہتر مقام ملے۔

۷ - نظام میں اس کی گنجائش بھی ہو کہ فرائض ادا کرنے والے استاد کے خلاف مناسب طریقے سے تادیبی کارروائی کی جاسکے اور یہ کارروائی کی بھی جائے۔

اس کے نتیجے میں اسلامی نقطہ نظر سے اچھے اور برے یا کامیاب اور ناکام استاد کا ایک واضح تصور ابھرے گا اور اچھے اور کامیاب استاد کے لئے ترقی کرنے اور اپنی پوری قیامت تک پہنچنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ استاد کی شہرت بطور ایک معلم کے، اس کی خدمت بطور ایک شہری کے اور اس کی حیثیت بطور ایک محقق اور مصنف کے معیار بنے گی۔ اس کے اثرات پورے نظام تعلیم پر ہوں گے۔

ترہیتی نصاب

اساتذہ کے لئے خصوصی ترہیتی ادارے اس دور کے ہر نظام تعلیم کا جز ہیں۔ اسلامی نظام کے تحت یہ ادارے غیر معمولی اہمیت کے مالک ہوں گے اس لئے کہ دراصل ان کی صحیح نیچ پر نظام تعلیم کی صحیح تشکیل کا مدار ہو گا۔

مختلف درجات و سطحوں کی تدریس کے لئے مختلف معیار کے ترہیتی ادارے اور ان کے نصاب ہو سکتے ہیں لیکن جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہر استاد کے لئے — خواہ وہ ابتدائی جماعتوں کو پڑھائے یا انتہائی

جماعتوں کو — تربیت ناگزیر ہے۔ اس تربیتی نظام کا مرکزی نکتہ یہ ہو کہ مستقبل کے اساتذہ میں ان کے نصب العین کا واضح شعور اور اس سے گہری وابستگی پیدا کرے۔ اور ان میں وہ اخلاقی کردار اور مشنری جذبہ پر دان چڑھائے جو انہیں اس منصب کے تقاضے صحیح صحیح ادا کرنے کے لئے تیار کرے۔

تربیت کے مختلف مراحل کے لئے نصابیات کی تشکیل اور پھر ان کے مطابق کتب کی تیاری کی جائے۔ اس عمل میں یہ اصول رہنا ہو سکتے ہیں :

۱۔ ان کو یہ تربیت دی جائے کہ وہ اپنے اپنے مضامین چاہے طبیعی و حیاتی علوم ہوں یا عمرانی اسلامی فلسفہ تعلیم کی مطابقت میں پڑھائیں۔

۲۔ انہیں اپنے ملک کے اور بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کے مسائل کے بارے میں شعور و آگہی فراہم کی جائے تاکہ وہ بعد میں اپنے زیر تعلیم تربیت طلبہ تک اسے منتقل کر سکیں۔

۳۔ انہیں اسلام کے فلسفہ تعلیم، مقاصد تعلیم اور مفکرین تعلیم کے خیالات سے آگاہ کیا جائے۔

۴۔ مغربی تعلیمی فکر اور طریقہ ہائے تدریس کا مطالعہ تنقیدی نقطہ نظر سے کروایا جائے۔

۵۔ نصاب میں ایسے عناصر نہ ہوں جو ان کے ذہن کو پراگندہ اور ان کی شخصیت کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے والے ہوں۔

۶۔ ایسی کتب استعمال کی جائیں جو اسلامی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہوں۔ ایسی تحریریں رسالے یا کتابیں کو رس میں نہ ہوں جو اجتماعی نصب العین کے بارے میں ایمان کو کمزور کرنے والی ہوں۔

۷۔ تدریس کو مؤثر کرنے کے لئے جدید سمعی و بصری آلات کے استعمال سے واقف کروایا جائے۔

دوسرا نقطہ نظر

اساتذہ کی تربیت کے بارے میں ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ ”اسلامی نظام تعلیم میں استاد کے معاملہ میں وسیع بنیادوں پر با مقصد تعلیم کو تخصیص پر ترجیح دی جائے گی۔ مسلم معاشرہ میں استاد کسی علیحدہ ادارے میں علیحدہ تربیت پانے والا محدود راہریا ٹیکنیشن نہیں ہے۔ مسلم معاشرے میں اساتذہ کی تربیت کے لئے خصوصی ادارے نظام تعلیم کے جزو کی حیثیت سے کبھی قائم نہیں کئے گئے۔ استاد کی تربیت

طالب علم کسی بھی نظام تعلیم کا محور ہے۔ بلند وبالا عمارتیں، انصاب ساز اور ان کی گوششیں، لائبریریا اور ورسی کتب کے انبار تعلیم سے متعلق سرکاری دفاتر اور ان کے ٹھاٹھاٹ، اساتذہ کرام اور ان کا معیار غرض پورے نظام کا محور ہی نکتہ یہ ہے کہ اس نظام میں حصول علم کے لیے آنے والا طالب علم ایسی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہو جو اس کے لیے، اور اس کی قوم اور اس کی تہذیب کے لیے نافع ہو۔ کسی تعلیمی نظام کی کامیابی یا ناکامی جانچنے کا پیمانہ بھی یہی ہے کہ اس سے فارغ التحصیل ہونے والا فرد، انسان مطلوب ہے یا نہیں کسی قوم کی اس سے بڑی بڑی نصیبی اور کیا ہوگی کہ اس کا نظام تعلیم ڈھانچے کے لحاظ سے ہر طرح مکمل ہو لیکن جو طالب علم وہاں سے فارغ ہو، اُسے دُنیا میں اپنے حقیقی مقام کا شعور نہ ہو، اس کی صلاحیتوں کو مطلوبہ نشو و نما نہ ملی ہو اور وہ اپنے ملک کے کسی شعبہ حیات میں مفید اور کارگر نہ ہو۔

طالب علم کا یہ محوری مقام اور اس کی اہمیت کسی اسلامی مملکت کے نظام تعلیم میں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ مقاصد تعلیم کے حصول میں کامیابی یا ناکامی جانچنے کا پیمانہ طالب علم کے اپنے نصب العین اور مقاصد تعلیم کے حصول میں کامیابی کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر ضروری سمجھا گیا کہ ایک علیحدہ باب قائم کر کے اس موضوع کا مطالعہ کیا جاتے۔

اس دائرے میں مسلمانوں کی تعلیمی روایت میں جو رجحان سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ طلب علم میں ان کا ذوق و شوق، محنت و مشقت اور اس کے لیے دور دراز کے سفر ہیں۔ یہ اس دور کے مسلمانوں کا مزاج تھا کہ خدا اور رسول کے واضح احکامات کے تحت طلب علم کو ایک مقدس دینی فریضہ سمجھتے تھے۔

مسلمانوں کی تاریخ اس نوعیت کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ حصولِ علم کا یہی شوق تھا جس نے انھیں چند صدیوں میں دنیا کی قیادت کے منصب پر فائز کیا اور انھوں نے علمی ترقی میں وہ کارنامے انجام دیے جن کے اثرات تاریخِ علم کے دیانتدار طالب علموں کی نظر میں آج تک چلے آ رہے ہیں۔ آج کے دور کے اسلامی نظامِ تعلیم میں طالب علم کا مقام متعین کرنے کے لیے ہم دوزاویوں سے جائزہ لیں گے۔

— طالب علم کا ریاست یا معاشرہ پر کیا حق ہے؟

— طالب علم پر ریاست یا معاشرہ کا کیا حق ہے؟

الف: طالب علم کے حقوق

۱۔ ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو فطرتِ سلیم پر ہوتا ہے۔ یہ معاشرے کا کام ہے کہ وہ اُسے مسلمان رکھے یا یہودی و نصرانی بنائے۔ اس اصول کے تحت تعلیمی نظام میں داخل ہونے والے ہر فرد کا یہ حق ہے کہ اسے ایسی تعلیم و تربیت دی جائے کہ وہ مسلمان رہے اس کا ایمان مضبوط ہو اور وہ اس کے تمام تقاضے پورا کرے۔ وہ کسی طاغوت اور باطل سے مغلوب و مرعوب نہ ہو، بلکہ اللہ کے کلمہ کو اونچا کرنے والا بنے۔

۲۔ ہر طالب کا یہ حق ہے کہ اسے ایسی تعلیم دی جائے جو ذاتی طور پر اس کے لیے اور ملک و ملت کے لیے نافع ہو۔ ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ معاشرہ کی ضروریات و امکانات کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لے اور پھر تعلیمی نظام کی ایسی منصوبہ بندی کرے کہ ملک کی افرادی طاقت کا بہترین ممکنہ استعمال ہو۔ تعلیم معاشرتی تقاضوں سے مربوط ہو، کسی شخص کو ضائع کرنے والی نہ ہو بلکہ اُسے مفید بنانے والی ہو۔ طلبہ ہوں یا طالبات، وہ ملازمت کریں، کاروبار کریں، یا گھر داری کریں، ان کی تعلیم ان کے لیے مفید ہو۔

۳۔ تعلیمی اداروں میں ضروری سہولتوں کی موجودگی بھی طالب علم کا حق ہے۔ اسلامی معاشرہ میں تعلیم کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر تعلیمی اداروں میں نظریے کی برتری کے ساتھ ساتھ ضروری سہولتوں کی فراہمی بھی ریاست کا فریضہ ہے۔

اگر حکومت اخلاص سے کوشش کرے تو اسلامی معاشرہ کے اندر سے اس مقصد کے ایسے وسائل کی فراہمی کوئی ناممکن کام نہیں۔ سہولتوں سے مراد آرام و آسائش نہیں لیکن کسی ملک کے عام معیار کے مطابق عمارات، آلات تدریس اور دیگر ضروریات تمام طلبہ کو یکساں انداز سے فراہم نہ کی جاتیں تو یہ فرائض میں کوتاہی ہے۔ بلکہ اگر وسائل کی فراوانی تعلیمی اداروں کو پُر آسائش بنانے کی گنجائش فراہم کرتی ہو تب بھی تعلیمی حکمت عملی یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ آسائش اور آرام کے عادی نہ بنیں۔

۴۔ معذور طلبہ کے لیے تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام ریاست کے فرائض میں ہوگا۔

۵۔ طالب علم کا یہ بھی حق ہے کہ جب وہ حصول علم کی تکمیل کرے تو معاشرے میں اُسے اپنی صلاحیت اور اہلیت کے مطابق روزگار فراہم ہو۔ اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے اور اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات کی ذمہ دار ہے۔ ضروریات کی فراہمی کا وسیلہ ذریعہ معاش ہے جو مختلف مراحل کی تعلیم سے فراغت کے بعد اس کی مناسبت سے فراہم ہونا چاہیے۔ بنیادی طور پر یہ مسئلہ مجموعی منصوبہ بندی سے مربوط ہے۔ اقتصادی منصوبہ بندی اور تعلیمی منصوبہ بندی میں ایسا رابطہ ہونا چاہیے کہ معاشرہ بے روزگاری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کا شکار نہ ہو۔ ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ روزگار فراہم ہو لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خود یہ روزگار فراہم کرے۔

ب۔ طالب علم پر ریاست یا معاشرہ کے حقوق

۱۔ اولین حق یہ ہے کہ حصول تعلیم و تربیت، اخلاص نیت سے ہو خالق کائنات کے بندے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے (اس حیثیت کا شعور پیدا کرنا تعلیم کا مقصدِ اولین ہے) زندگی کی تمام سرگرمیوں کا اور بالخصوص دورانِ تعلیم سرگرمیوں کا محورِ رضائے الہی کا حصول ہونا چاہیے۔ طالب علم اپنی صلاحیتوں کو نشوونما بھی دے مستقبل میں معاشرے کے لیے اور خاندان کی کفالت کے لیے اہلیت بھی پیدا کرے، ملک و ملت کی خدمت

کا جذبہ بھی بیدار کرے لیکن سب اس لیے کہ اُس کا رب اس سے راضی ہو۔

۲۔ طلب علم کو وسیع ترین معنوں میں اپنا فریضہ تصور کرے، سُن شعور کو پہنچنے کے بعد ایک مُسلمان طالب علم کے رویے میں اس احساس و شعور کا عکس ملنا چاہیے اس کو ذمہ دارانہ رویہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور اس کے اجزاء یہ ہیں۔

الف۔ ذوق و شوق ب۔ محنت و مشقت

ج۔ دیانتداری د۔ احترام اساتذہ

۵۔ خدمت معاشرہ

۳۔ معاشرہ نے اپنے اوپر بار ڈال کر بعض صورتوں میں تکالیف اٹھا کر اُس کے لیے جو سہولتیں فراہم کی ہیں ان کا ہر ممکن استعمال کرے اور معاشرہ کا احسان مند ہو۔ بلاوجہ غیر حاضری، لاتبریسی کی کتب کا عدم استعمال اور جان بوجھ کر توڑ پھوڑ، احسان فراہمی کی تعریف میں آتا ہے۔

۴۔ تعلیم کے لیے مسابقت محض اور محض صلاحیت و قابلیت کی بنیاد پر ہو۔ ریاست اس کی ذمہ دار ہو اور ایسی تدابیر اختیار کرے کہ انتخاب میں دولت یا کسی خاص طبقہ سے وابستگی وجہ تزیج نہ بنے۔ شہریوں کے درمیان اس بنیاد پر کوئی تفریق نہ ہو۔

۵۔ جو علم کی روشنی اسے نصیب ہوئی ہے، اسے آگے پھیلانے، اپنے اہل خاندان میں، محلہ میں، ملک میں اشاعت و فروغ علم میں مثبت کردار ادا کرے۔

۶۔ معاشرہ میں اسلامی خطوط پر تبدیلی لانے اور اس میں اسلامی اقدار کو غالب رکھنے میں اسلامی نظام تعلیم کے تربیت یافتہ شخص کی حیثیت سے قرار واقعی حصہ ادا کرے۔

۷۔ اسلامی معاشرہ اپنے مسائل حل کرنے کے لیے خدمت معاشرہ کے جو ادارے تشکیل دے ان میں فعال حصہ ادا کرے۔ اس کا ایک پہلو دوران طالب علمی کا گزارسی کا ہے اور دوسرا یہ کہ مدت تعلیم کے اختتام پر ایک مقررہ مدت کے لیے ان اداروں میں ہمہ وقتی کام کرے اور تیسرا یہ کہ برسر روزگار ہونے کے بعد بھی ان اداروں میں معاشرہ کے ایک کارفرما کن کی حیثیت سے سرگرم دلچسپی لے۔

۸۔ طالب علم پر معاشرہ کے حقوق کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ حصول علم کے بعد طالب علم کی اولین ترجیح اپنے ملک میں رہ کر خدمت کرنے کی ہو۔ معاشرہ اس کی خدمات کا جو معاوضہ بھی اسے دے سکے وہ اسے قبول کرنا چاہیے۔ اور باہر کی شرح سے مقابلہ کر کے اس معاشرہ کی تضحیک نہ کرنا چاہیے جس نے اس کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے بہت سے منصوبے مؤخر کیے۔ اگر سب تعلیم یافتہ افراد اپنے ہی ملک میں اپنی صلاحیتوں اور حوصلوں کو آزمائیں تو ان کے اپنے ملک میں بھی دنیاوی ترقی کی وہ کیفیت نصیب ہو سکتی ہے جو باہر نظر آتی ہے۔ اور بڑے پیمانہ پر باہر جانے کا رجحان ہو تو یہ ملک کو معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور نفسیاتی مسائل میں مبتلا کر کے بالآخر بحران کا شکار کر دیتا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم کے تربیت یافتہ نوجوانوں کا مطمح نظر دنیا نہ ہونا چاہیے ان کی نظر آخرت کے دن پر ہونا چاہیے۔ اگر ملت اسلامیہ کی مجموعی منصوبہ بندی کا تقاضہ یہ ہو کہ کچھ افراد باہر جا کر کام کریں تو ملکی منصوبہ بندی کی حدود میں اس کی گنجائش پیدا کی جائے۔

اس بحث کے آخر میں جو نکتہ سب سے زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ معاشرہ اور طالب علم کے حقوق و فرائض اپنی جگہ لیکن اسلامی ریاست کا اصل فریضہ یہ ہے کہ ملک کے ہر بچے کو، لڑکا یا لڑکی، طالب علم بنائے تاکہ مستقبل کا ہر شہری ان حقوق سے متمتع ہو جو ریاست تعلیم گاہوں سے وابستہ طالبان علم کو فراہم کر رہی ہے اور ان فرائض کو بہتر طور پر ادا کرنے کے قابل ہو سکے جس کی توقع ایک اسلامی معاشرہ اس سے کرتا ہے۔

۳۔ نصاب

نصاب نظام تعلیم کا اہم عنصر ہے اور طالب علم کے ذہنی و عملی رویے کی تشکیل میں قابل لحاظ کردار ادا کرتا ہے۔ نصاب کسی بھی نظام تعلیم کا عکس ہوتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اس نظام کو بنانے اور چلانے والے اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نصاب کے ذریعے مقاصد تعلیم کے حصول کی ایک مؤثر حکمت عملی ریاست کے ہاتھ میں آتی ہے۔

نصاب کی اس اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ طلبہ اور اساتذہ کے باہمی ربط کی بنیاد یہی ہوتا ہے۔ نصاب کے موضوعات ہی استاد کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ طالب علم کے کانوں تک پہنچتے ہیں، تبادلاً خیال انہی موضوعات پر ہوتا ہے اور طالب علم کی تحریری (و تقریری) مشق، محنت اور امتحان کی تیاری انہی موضوعات کے گرد ہوتی ہے۔ وہ انہی موضوعات پر مقررہ درسی کتب کے علاوہ دیگر کتابیں تلاش کرتا اور پڑھتا ہے۔

اتنا اہم عامل، قدرتی طور پر اسلامی نظام تعلیم میں بھی اہمیت رکھتا ہے بلکہ نظریاتی ہونے اور طلبہ کی فکر اور سوچ کو واضح رخ دینے میں دلچسپی رکھنے کی وجہ سے یہ نصاب کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اغلباً یہی وہ موضوع ہے جس پر فلسفہ تعلیم کے بعد مسلم مفکرین نے سب سے زیادہ اظہار خیال کیا ہے۔ خصوصاً گزشتہ ۵۰ سال میں جب سے اُمتِ مسلمہ کی فکری قیادت نے احیائے اسلام کی جدوجہد شروع کی ہے اس پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ *

نصاب سازی

اسلامی نظام تعلیم میں کون سے نصاب پڑھاتے جاتیں گے، اس پر کسی بحث سے پہلے یہ بتانا ضروری * انھوں نے اس حقیقت کا ادراک کیا ہے کہ غیر ملکی آقاؤں نے سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی اور حکمت عملی سے پہلے سے رائج نظام تعلیم کی عملی اہمیت ختم کر کے اپنا وہ نظام تعلیم رائج کیا جس میں ان کے مقصد کے لحاظ سے مرتبہ نصاب پڑھایا گیا اور اس طرح مسلمانوں کی نسلیں ان کے مفادات کی تکمیل کرنے والی بن گئیں۔ آج بھی کسی قوم میں کسی نظریہ کے نفوذ کا سب سے دیرپا اور مؤثر نسخہ یہی ہے کہ اس کے تعلیمی نظام اور نصابات اس کے سانچے میں ڈھال دیے جاتیں۔ حالیہ زمانے میں روسی اس نسخے کو افغانستان میں استعمال کر رہے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں اس کے حالیہ اقدامات کی طرف اشارہ دیں گے جہاں فرمان نمبر ۲۶ جاری کیا گیا جس کا تعلق تعلیم کو کمیونسٹ تقاضوں کے مطابق ڈھالنے سے ہے۔ ایک سال پہلے، پہلی سے چوتھی جماعت تک تبدیلیاں کی گئی تھیں لیکن اب پہلی سے نویں جماعت کے بچوں کے پورے تعلیمی نصاب کو تبدیل کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ نئے نصاب میں افغانستان کی اسلامی روایات، تاریخ، اسلامی ممالک سے تعلق کا کوئی ذکر کسی مضمون

ہے کہ اس نظام میں نصاب سازی، تعلیم کی اہم سرگرمی ہوگی جس میں حکومت اور معاشرہ کے ان تمام عناصر کی بشمول، اساتذہ و ماہرین تعلیم کی شرکت کو یقینی بنایا جاتے گا جن کے مشورے اس کا قبلہ درست رکھنے اور اس کی افادیت، عملیت اور معاشرے سے اس کے ربط کو برقرار رکھنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ نصاب سازی ایک مسلسل عمل ہوگا جس میں تجربات اور نتائج پر غور و فکر اور سوچ بچار جاری رہے گا۔ نصاب بنانے کے بعد نصاب کی ترویج اور اس میں پیش آنے والی زیادتیوں اور مشکلات کو دور کرنے کی سعی بھی کی جائے گی۔ یہ دیکھا جائے گا کہ درسی کتب نصاب اور اس کی رُوح کے مطابق لکھی جارہی ہیں اور پڑھائی جارہی ہیں۔ نیز نصابات کے لیے راہنما اصول اور بنیادی خاکوں کے برابر ہیت، کتب کی تیاری و ترویج اور مطلوبہ نتائج کے حصول میں ان کی کارکردگی کو ملے گی۔ اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ اس کام کے سارے مراحل وہی اہل و قابل افراد طے کر سکیں گے جو اس نظام تعلیم کے مقاصد کا شعور رکھتے ہوں اور ان کے حصول سے قلبی لگاؤ رکھتے ہوں۔

آئندہ سطور میں اسی نصاب سازی کے لیے کچھ راہیں متعین کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔

مرکزی ادارہ برائے نصاب سازی

کسی اسلامی معاشرہ میں نصاب سازی نظام تعلیم کا وہ شعبہ ہے جو براہ راست کسی نگرانی میں روبہ عمل ہونا چاہیے اور کسی ایک مرکزی ادارہ کو پورے ملک کے لیے بنیادی نصابات کی تشکیل کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔ یہ ادارہ ملک کے ان افراد پر مشتمل ہو جو اپنے علوم کے ماہر ہیں نہ ہوں اسلامی نظریہ کا گہرا شعور بھی رکھتے ہوں اور تعلیم کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے نصابات میں جس

میں نہیں ہوگا اور افغانستان کو روسی اور سوشلسٹ دنیا کا حصہ ظاہر کیا جائے گا۔ ۱۶ جنوری ۱۹۸۳ء کو ریڈیو کابل سے نصابی کتابوں کے محکمہ تالیف و ترجمہ کے ایک اعلیٰ افسر نے نئے نصاب کے بارے میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ مذہب نے ہمارے معاشرے کو غلام بنا دیا ہے۔ نیا نصاب افغانستان کو آزاد کرادے گا۔“

(نوائے وقت ۱۹ جنوری ۱۹۸۳ء)

حکمت عملی کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے اس کا تجربہ بھی ان کو ہو۔ اس کام کے لیے اس ادارہ کو ایسا طریقہ کار وضع کرنا چاہیے کہ ملک میں موجود صلاحیت کا بہترین اور مفید ترین استعمال ہو۔ اس وقت بھی مختلف ممالک میں یہ شعبہ نہایت منظم اور مربوط شکل میں کام کرتا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں تو اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہونا چاہیے۔ متعلقہ مرحلہ کے اساتذہ سے مشورہ کا نظام ہو۔ ماہرین کی کمیٹیاں جائزے اور تجاویز تیار کریں، ان پر دوسرے ماہرین سے رائے اور جائزہ کا نظام ہو۔ علما نصاب کو استعمال کر کے اس کے نتائج و اثرات کا مطالعہ کیا جائے۔ دوسرے مسلم ممالک کے ماہرین سے مشورہ کیا جائے اور ان کے عملی تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس ادارہ کا مستقل ڈھانچہ ہو جہاں تعلیم کے اسلامی مقاصد سے شغف رکھنے والے اہل افراد جمع کیے جائیں۔ مضمون کے ہر مرحلہ اور سطح کے لیے افراد کا تعین ہو جو اس میں اختصاصی مہارت حاصل کریں۔ یہ حکمت عملی نصاب کی مرکزی اہمیت کے پیش نظر ناگزیر ہے۔ نصاب پوری قوم کی نئی نسل کی ذہنی تربیت کے لیے خطوط مہیا کرتا ہے اور اس کا ایک منبع سے تیار ہونا نظریاتی یکسانی، سلامتی، فکر اور قومی ہم آہنگی کے لیے ضروری ہے۔ تعلیمی اداروں کے لیے سرکاری ہوں یا نجی، نصاب کی پیروی لازمی ہو۔

نصاب سازی سے متعلق بعض اہم امور

اس حصے میں کچھ ایسے امور بیان کیے جا رہے ہیں جو اسلامی تصور تعلیم اور عام تعلیمی نفسیات کے تحت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے حصے میں بنیادی عنصر کے عنوان کے تحت نصابی علوم کے نظریہ حیات سے، معاشرہ سے، اور فرد سے تعلق اور اس کے تقاضوں کو واضح کیا جائے گا۔

- ۱۔ تعلیم کا آغاز قرآن پاک کی تدریس سے ہونا چاہیے۔ قرآن پاک وحی الہی ہے اس سے قلبی تعلق قائم کرنے کے لیے سب سے اول اس کی ناظرہ تعلیم ضروری ہے۔ یہ عملی تجربہ ہے کہ جنھوں نے نہیں پڑھا ہے۔ اور جنھوں نے پڑھا ہے دونوں میں تین فرق ہوتا ہے۔

اسلام کے متعلق ان کے علمی رویہ میں فرق ہوتا ہے *

۲۔ قدیم نظریہ نصاب سازی کے مطابق جو تصورات ذہن میں بیٹھ جاتے ہیں وہ مستحکم ہوتے ہیں اور آخر عمر تک ذہن سے محور نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ بنیادی عقاید اللہ و رسولؐ کی باتیں اور اخلاق و کردار پر ابتدا سے زور دیتے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے بھی فرمایا ہے کہ جب بچہ کی زبان کھل جائے تو اس کو لفظ اللہ اور کلمہ سکھاؤ۔ جدید طریقہ نصاب سازی یہ ہے کہ اشیاء کی تصاویر اور اشیاء کے ناموں سے تعلیم کو آگے بڑھایا جائے۔

۳۔ تدریس کے ہر مرحلہ پر متعلقہ عمر کی نفسیاتی ضروریات کے مطابق دین کے حقیقی تصور کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامیات یا کسی بھی عنوان سے ایک لازمی نصاب ہونا چاہیے۔ اس نصاب کو طالب علم کے علمی رویہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنا ہے اس نقطہ نظر سے اس کو انتہائی محنت سے تیار کیا جانا چاہیے۔ اس نصاب سے ہی یہ مقصد حاصل ہونا چاہیے کہ مسکلو کے اختلاف سے ملت میں جو انتشار ہے نئی نسل کو اس سے محفوظ رکھ کر انھیں دین اسلام کے کلمۃ سوائے پر مجتمع کیا جائے تاکہ اعتصام بحبل اللہ کی کیفیت عملاً رونما ہو۔ اسلامیات کے خصوصی نصاب مختلف پیشوں کے ساتھ مربوط کر کے بھی بنائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً طب یعنی میڈیسن کے سلسلہ میں قرآنی آیات، احادیث اور فقہ کے احکام پر مشتمل ایک لازمی نصاب تیار ہو سکتا ہے۔

۴۔ یہ حقیقت نظر سے اوجھل نہ ہو کہ ایک فرد کی شخصیت ایک اکائی ہے جس کی تعمیر اور تشکیل کے لیے ہدایت کا منبع بھی ایک یعنی وحی الہی ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے ہدایات بھی اس ذریعے سے ملتی ہیں اور ان کو اختیار کرنے سے عملی زندگی ایک وحدت میں مربوط ہو جاتی

* مغربی حکمرانوں نے یہ مغالطہ دے کر اعلیٰ طبقہ کے بچوں کو قرآن پڑھنے سے محروم کر دیا کہ اول تو ناظرہ پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں، معانی کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ دوسری دلیل یہ دی کہ چھوٹی عمر میں غیر زبان کے الفاظ بلا سمجھے پڑھنے سے ذہن کند ہو جاتا ہے۔ اس لیے جو انگریز پرست طبقہ پیدا ہوا وہ بالعموم اپنے بچوں کو قرآن ناظرہ نہیں پڑھاتا الا ماشاء اللہ۔ واضح رہے کہ اجنبی زبان (انگریزی) بالکل چھوٹی عمر میں بچوں کو پڑھوانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

ہے۔ قرآن اور حدیث نے اعمالِ صالحہ کا علم دیا ہے اور اس پر خدا کی رضا کی خوشخبری دی ہے۔ اور اعمالِ ستیہ سے روکا ہے اور اس پر خدا کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ ان کا تعلق ان متعدد علوم کے دائرے سے ہے جو نصاب میں پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً معاشیات، سیاسیات، قانون، طب وغیرہ۔ نصابی حکمتِ عملی میں ان علوم کا علم اس طرح حاصل کیا جانا چاہیے کہ یہ وحدتِ ختم ہو کر طالبِ علم کے ذہنی اور عملی رویہ میں زندگی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تقسیم نہ ہو جائے بلکہ اس سے مثبت طور پر ہم آہنگ رویہ کی تشکیل ہو۔

۵۔ نصاب کو (Work Oriented) ہونا چاہیے۔ یہ ایک اہم اسلامی قدر ہے اور اسوۂ حسنہ کی وہ مثالیں سب کے علم میں ہیں کہ رسول پاک اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں عار محسوس نہ کرتے تھے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ہر مرحلہ پر مختلف مضامین کے ساتھ کچھ نہ کچھ سیکھنے کو متعلق کرنا چاہیے سائنس کے پیکٹیکل بھی اس دائرہ میں آتے ہیں لیکن یہاں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تصویر پیش نظر ہے۔ نماز کی علی تعلیم، باغبانی، صحت، صفائی کا لحاظ، درس گاہ کی صفائی، رنگ و روغن، اور اس طرح کے بے شمار عملی کام ہیں جو طالبِ علم کو نصاب کے جزو کے طور پر کرنا چاہیے اور اس کی کامیابی اور آئندہ ترقی میں اس کا کردار ہونا چاہیے۔ اس کا دوسرا پہلو درس گاہ سے باہر کیے جانے والے کام ہیں جن کو ہر مرحلہ کے نصاب کا جزو بنایا جانا چاہیے مثلاً کسی ناخواندہ بنانا، بے نمازی کو نمازی بنانا، فجر کے لیے اہل محلہ کو بیدار کرنا، مسجد کی خدمت کرنا، دعوتِ دین میں حصہ لینا محلہ کے اہل حاجت کے کام آنا، یہ وہ کام ہیں جو خلفائے راشدین کے بلا تکلف انجام دیے ہیں۔ اس کی محض تلقین کافی نہیں، اسے نظامِ تعلیم کا حصہ ہونا چاہیے۔

۶۔ نصاب کو (Research Oriented) ہونا چاہیے۔ یہ خیالِ ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ ریسرچ آخری مرحلہ پر یا فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی کی جائے۔ اگر طالبِ علم میں تخلیقی ذہن پیدا کرنا ہے تو ابتداء میں ہی اس کے ذہن کو اس کی تربیت

ملنا چاہیے۔ غور و فکر کرنے کی اہمیت تو قرآنی احکامات سے ظاہر ہے لیکن اس کی تربیت مسلمان طلبہ کو نظام تعلیم اور اس کے نصاب سے ملنا چاہیے۔ طالب علم کی ذہنی سطح اور عمر کے لحاظ اور اس کے آس پاس کے ماحول سے متعلق ایسے بہت سے مسائل ہیں جن پر اس سے آزادانہ فکر کی کوشش کروانا چاہیے۔ اس طرح کے مسائل سوچنا استاد کے لیے بھی ایک تخلیقی مشق ہو سکتی ہے۔

۷۔ نصاب کو ہنر (Skill) سکھانے والا ہونا چاہیے۔ یہ لازمی تعلیم کا جزو ہو اور اس کا مقصد محض معاش کے لیے تربیت دینا نہ ہو بلکہ ہر تعلیم یافتہ شخص کو باہر نکلنا ہوتا کہ وہ اپنے گھر میں اور معاشرہ میں مفید ہو۔

۸۔ نصاب کے بارے میں ایک ضروری امر یہ ہے کہ غیر ضروری اور غیر مفید تعلیم ہے اسے بھاری بنا کر طالب علم کو اس کے بوجھ تلے دبانا دیا جائے۔ یہ مسئلہ انتہائی غور و فکر مہارت اور لکچریشن کی ذہنیت سے آزاد ہو کر اقدامات کرنے کا طالب ہے۔ یہ طرز فکر کہ ہر قومی مسئلہ کا حل یہ ہے کہ فلاں چیز نصاب میں شامل کر دی جائے، مناسب نہیں، اس طرح طالب علم کو غیر ضروری بوجھ سے لادنے سے اس کی دلچسپی سرے سے حصول علم میں ختم ہو جاتی ہے۔ نصابی حکمت عملی کا ایک اہم جزو یہ ہونا چاہیے کہ نصابیات کی مسلسل چھانٹی (Purning) کی جاتی رہے۔ آٹھویں جماعت تک کے لازمی نصاب سے اس طرح کی تمام باتیں نکال دینا چاہئیں جو توے فی صد افراد کے ساری زندگی کسی کام نہیں آتیں۔ لیکن وہ باتیں ضرور شامل ہونا چاہئیں جو کام آتی ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ اس عمل میں ہر ملک کو اپنے مختلف علاقوں کی ضروریات کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

۹۔ اسلام کا اپنا منفرد ذوق جمالیات ہے اور اس کا اظہار نصاب میں ہونا چاہیے۔ فن قرأت اور فن خطاطی جس کی اساس پہلی وحی کے الفاظ اقراء اور قلم کسے جاسکتے ہیں، مسلمانوں کے ذوق جمالیات کے اظہار کا خاص میدان رہے ہیں اور انھوں نے اس میں نادر نمونے پیش کیے ہیں۔

۱۰۔ جنسی تعلیم بھی ایک ضروری تعلیم ہے اور نصاب کو اس سے آنکھیں بند نہیں کرنا چاہئیں۔ لیکن یہ تعلیم اسلام کے مزاج کے مطابق فقہ اور طہارت کے ابواب میں دی جاسکتی ہے۔ علم نفسیات و حیاتیات جاننے والے علماء اور علم دین جاننے والے ماہرین نفسیات و حیاتیات اس سلسلے میں ایسا کورس بنا سکتے ہیں جس کا ایک حصہ آٹھویں یا میٹرک تک کی لازمی تعلیم کا جزو ہو اور طلبہ و طالبات کے لیے علیحدہ ہو۔

۱۱۔ فوجی تربیت بھی اسلامی تعلیم کا ایک ضروری حصہ ہے مسلمانوں کو ایک عسکری مزاج رکھنے والی قوم ہونا چاہیے اور اس کی عملی تربیت بھی دی جانا چاہیے۔

۱۲۔ ذریعہ تعلیم ایسی زبان ہونا چاہیے جو اس ملک یا علاقے کی زبان ہو اور جس میں طلبہ مافی الضمیر ادا کر سکیں۔ جنسی زبان تخلیقی صلاحیتوں کا مٹھ مار دیتی ہے اور اپنی زبان اس کے سوتے جاری کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔

یہ نصاب سے متعلق وہ عمومی امور ہیں جو اسلامی نقطہ نظر سے موجودہ پس منظر میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اب مختلف علوم کے نصاب کے بارے میں بنیادی نقطہ نظر پیش کیا جائے گا۔

نصاب کے بنیادی عناصر

ملت اسلامیہ کے کسی ملک کے تعلیمی نظام کے لئے نصاب کی تشکیل میں جو بنیادی عناصر کارفرما ہونا چاہئیں، وہ یہ ہیں۔

۱۔ نظریہ حیات، یعنی اسلام تمام نصاب کی روح ہو گا۔ کوئی بھی نصاب، کسی بھی درجے میں پڑھایا جا رہا ہو، وہ نظریہ سے بے نیاز ہو سکتا ہے، نہ ہونا چاہیے۔

۲۔ محاشرہ، یعنی اس ملک میں بسنے والوں کی قومی تاریخ، ان کے مسائل اور ان کی ضروریات نصاب میں لازماً منعکس ہوں۔

۳۔ فرد کو ملت اسلامیہ کا ایک فرد، اپنے ملک کا شہری، اپنے علاقے کا باشندہ، مرد یا عورت اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں، قابلیتوں اور رجحانات کے ساتھ اس کا خلیفہ ہونے

کے لحاظ سے مکمل کرنے کے لئے نصاب کو مناسب لوازم فراہم کرنا چاہیے۔

۱۔ نظریہ حیات اور نصاب

[illegible]

یہ فلسفہ زندگی، نظام فکر و عمل یا نظریہ حیات انسان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل کر دیا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں تمام علوم اسی ہدایت سے اخذ کردہ اصولوں پر مبنی ہوں گے۔ وحی الہی کی رہنمائی میں علوم کے لئے وہ تقصیرات تشکیل دیئے جائیں گے جو اسلام کے تصور کائنات و انسان کے مطابق ہوں اور جنہیں حاصل کر کے انسان ادھر ادھر بٹکنے کے بجائے سراطِ مستقیم پر چلے اور علمی ترقی و تحقیق کے باب میں اپنی روایات کو زندہ کرتے ہوئے نئے نئے کارنامے کرے اور دنیا کی نیابت و امامت حاصل کرے۔

انسانی تصور کے تحت علوم کی یہ تقسیم کی جاسکتی ہے۔

۱۔ دینی اہل کے ذریعے حاصل شدہ العلم، جو قرآن و سنت اور اس سے متعلق علوم پر مبنی ہے۔

۲۔ اکتسابی علوم جس میں تمام (۱) عمرانی علوم (ب) فطری علوم (ج) اطلاقی علوم اور (د) ادبیات و فنون شامل ہیں۔

۱۔ علوم کی یہ پہلی قسم جس کو علوم اسلامی کے ذیل میں، یا اسلامیات یا دینیات یا اسلامی

حکمتِ حیات کے عنوان کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے بنیادی طور پر قرآن اور اس کی تفسیر، حدیث اور اس کی تشریح اور فقہ اور اس کی حکمت اور سیرت پر مشتمل ہوگی اور ان کے نصابات کی تشکیل اور تدریس میں اس سطر پر سے استفادہ کیا جائے گا جو اس دور میں تیار ہوا ہے اور دین کو روایتی مذہب کے بجائے زندگی کے مسائل سے متعلق ایک طرزِ حیات کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ۷

اسلامی علوم کی مختلف شعبوں میں اور ہر شعبہ میں اختصا ص حاصل کرنے والوں کی مسلسل ضرورت ہے اس کے لئے منفصل نصابات تشکیل دینے چاہئے۔

ایک شعبہ قرآن کے تحقیقی مطالعہ کا ہو جس میں پچھلے مفسرین کے کام کا جائزہ لینے کے بعد آگے مزید کام کیا جائے، مختلف پہلوؤں سے قرآن کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی جائے اور علوم انسانی کے تمام شعبوں سے استفادہ کر کے قرآن میں مزید بصیرت حاصل کی جائے۔ اس طرح ایک شعبہ علوم حدیث کا ہونا چاہیے جس میں قدیم محدثین کے کام سے پورا فائدہ اٹھانے کے بعد حدیث میں تحقیق، تنقید، ترتیب معلومات اور اخذ نتائج کا مزید کام کیا جائے۔ دورِ سعادت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیلات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی جائیں اور ان سے وہ نتائج اخذ کئے جائیں جو اب تک ہمارے علم سے مخفی ہیں۔ ایک شعبہ قانون کا ہونا چاہیے جس میں قرآن کے احکام، حدیث بنوئی کی قوی و عملی تشریحات صحابہ کرام اور تابعین کے اجتہادات اور ائمہ مجتہدین کے طرزِ استنباط اور جزئیات میں ان کی تصریحات کا مفصل تحقیقی مطالعہ کیا جائے نیز دنیا کی دوسری پرانی اور نئی قوموں کے قوانین اور قانونی نظامات پر بھی گہری نظر رکھی جائے۔ اور زندگی کے روز بروز بدلنے والے معاملات و مسائل پر اصول قانون اسلامی کو منطبق کر کے فقہ کے ان چٹموں کو پھر سے رواں کیا جائے جو صدیوں سے سوکھ رہے گئے ہیں۔ یہ شعبہ نہ صرف بجائے خود بہت عظیم الشان کام انجام دیں گے، بلکہ دوسرے تمام شعبوں کو بھی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے متعلق ان ہی سے وہ مواد ملے گا جس کی بنیاد پر علم کی تمام راہوں میں تحقیق و اکتشاف کا کام چلایا جائے۔ ۹

۳۔ اکتسابی علوم (Acquired Knowledge) میں شامل تمام علوم کے

نصاب کے لئے بنیادی تصورات قرآن کریم سے اخذ کئے جائیں گے۔ اگر ہر شعبہ علم سے متعلق قرآن کی آیات جمع کی جائیں تو اس کی حد تک وہ خطوط متعین ہو جاتے ہیں جن کو بنیاد بنا کر اس کو نظر یا قی آہنگ دیا جاسکتا ہے (اس مرحلہ پر ہمارا موضوع یہی ہے۔ ہر نصاب میں جدید ترین تحقیقات اور ملکی حالات و ضروریات کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے۔)

عمرانی علوم

عمرانی علوم کا تعلق فرد اور معاشرے، ان کے باہم عمل، رد عمل اور کردار سے ہوتا ہے۔ ان کلمہ کزی نقطہ حوالہ خود انسان کی ذات اور اس کے قائم کئے ہوئے ادارے ہیں۔ انسان فہم و ادراک اور شعور و اختیار رکھنے والی ہستی ہے جس کے لئے دنیا میں سب کچھ پیدا کیا گیا ہے۔ یہاں زندگی گزارنے کے لئے اسے اپنی حقیقت، کائنات میں اپنے مقام اور خیر و شر کی حقیقت کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔ یہی علم قرآن فراہم کرتا ہے۔

عمرانی علوم کے جو شعبے معدود ہیں، یعنی فلسفہ، نفسیات، عمرانیات، تاریخ، معاشیات، سیاسیات ان سب کے بارے میں بنیادی رہنمائی وحی الہی سے ملتی ہے۔ عمرانی علوم کا غائی مقصد نہ صرف فرد اور معاشرے کے تعلق سے انسان کی تفہیم ہے بلکہ خیر و فلاح کی طرف ان کی راہنمائی بھی — اور یہی قرآن کا موضوع بھی ہے۔

فلسفہ میں جو علوم کا ایک اہم شعبہ ہے، اور جو دوسرے علوم کی صورت گری میں بھی حصہ ادا کرتا ہے، قرآن سے راہنمائی حاصل کر کے نصاب بنایا جائے کہ عقل انسان کی رسائی کہاں تک ہے اور کن حدود سے وہ محدود ہے۔ مجرد استدلال پر تخیلات کی عمارت کھڑی کرنے سے انسان واقعات و حقیقت کی دنیا سے الگ ہو کر خیالات کی تاریک دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔ مابعد الطبیعی امور کے متعلق کتنا علم انسان کے لئے کافی ہے۔ اس ضروری علم تک پہنچنے کے لئے مشاہدہ اور استقراء سے کس طرح کام لینا چاہیے۔ کن امور مابعد الطبیعی کا یقین ہم کر سکتے ہیں اور کن کے متعلق ایک محفل اور مطلق حکم سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور کہاں پہنچ کر اجمال کو تفصیل سے بدلنے یا اطلاق کو تقلید میں تبدیل کرنے کی کوشش نہ صرف بے بنیاد ہو جاتی ہے بلکہ انسان کو تخلیقاتِ لا طائل کی غرل بھیلیوں میں جھکا دیتی ہے۔ نہ

تاریخ ان علوم میں سے ہے جو جوہرِ انسانی کی فکر و کردار کو فیصلہ کن انداز سے متاثر کرنا ہے، قرآن کا فلسفہ تاریخ اور مقصد مطالعہ تاریخ نیا بائے قرآن کی روشنی میں نوع انسانی کی سرگزشت اور تہذیب انسانی کے نشو و ارتقاء کا مطالعہ کر کے انسان کی فلاح و خیران، سعادت و شقاوت اور عروج و زوال کے مستقل اصول بتیڈ کئے جائیں۔ مذلتِ ایمان بین الناس جس ضابطہ کے مطابق ہوتی ہے اسے معلوم کرے جو اوصاف انسان کو ادبہ اٹھاتے ہیں اور جو اسے نیچے گرا دیتے ہیں ان سے واقف ہو اور خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے کہ کس طرح فطرت کا ایک خط مستقیم ابتداء سے آج تک سیدھا کھینچا ہوا نظر آتا ہے۔ اس خط سے ہٹ کر جو بھی دائیں یا بائیں جانب نکل گیا تو اسے تھپڑ کھا کر اسی طرف چلا پڑ اور نہ پھر ایسا پھینکا گیا کہ اس کا پتہ نشان نہ ملا۔ لے اسی طرح قرآن کی رہنمائی میں اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے عروج و زوال کے مطالعہ کے لئے نصاب بنایا جائے۔

سیاسیات میں قرآنی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے نظام حکومت و سیاست کے مختلف پہلو طلبہ پر واضح کئے جائیں، فرد اور ریاست کے حقوق و تعلقات کے ضمن میں قرآن و سنت، خلفائے راشدین کے دور کے نظائر سے اصول متین کئے جائیں، حکومت کے منصب اعلیٰ کی ذمہ داریاں، کارکن کی ذمہ داریاں عدلیہ و مقننہ کے اختیارات سب اسلامی تصورات کی روشنی میں متین کئے جائیں اور بطور نصاب پڑھائے جائیں۔ ۱۲

معاشیات میں جو آج کے دور کا انتہائی اہم علم ہے، قرآن کی رہنمائی میں نصاب سازی کی جائے۔ مسلم معاشی مفکرین نے اتنی رہنمائی دے دی ہے کہ نصابیات کی تشکیل اسلامی تصورات کے مطابق کی جاسکتی ہے ۱۳

فطری علوم

فطری علوم میں وہ تمام علوم شامل ہیں جو بظاہر فطرت کی تقسیم اور تسخیر کو اپنا مقصد قرار دیتے ہیں، انسانی زندگی کے لئے ان علوم کی اہمیت ناقابل انکار ہے۔ ”قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں ہے اور نہ اس کے مروجہ کا براہ راست سائنس سے کوئی تعلق ہے چونکہ یہ اسی مصنف کی تالیف ہے جس نے کائنات کو تصنیف کیا ہے اور وہ مصنف اپنی ایک کتاب سے دوسری کتاب میں جگہ جگہ استدلال و استنباط سے کام

یتا ہے اسی لئے اس کے گہرے مطالعہ سے سائنس کے ایک طالب علم کو نہ صرف نظام کائنات کا بنیادی فارمولا معلوم ہو جاتا ہے بلکہ قریب قریب ہر شعبہ علم میں اسے صحیح نقطہ نظر اور تلاش و تجسس کے لئے ایک صحیح رُخ بھی ملتا ہے۔^{۱۴} حقیقت یہ ہے کہ سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو انسانوں کے دل میں ایمان کو گہری جڑوں سے راسخ کر دینے والا نہ ہو۔ فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، فزیالوجی، انالومی، اسٹرانامی غرض جس علم کو بھی آپ دیکھیں ایسے ایسے حقائق سامنے آئیں گے جو انسان کو سچا اور پکا مومن بنادینے کیلئے کافی ہیں۔ سائنس کے حقائق سے بڑھ کر آدمی کے دل میں ایمان پیدا کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ یہی تودہ آیات الہی ہیں جن کی طرف قرآن بار بار توجہ دلاتا ہے۔^{۱۵}

یہی وہ روح ہے جو فطری علوم کے تمام شعبوں میں جاری و ساری ہونا چاہیے۔ طالب علم کائنات فطرت کا مطالعہ کرے اور یہ جاننے اور سمجھنے کے اس کے نیچے اصل کار فرما قوت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہر شعبہ علم سے متعلق قرآن کی آیات موجود ہیں جو مناسب انداز سے نصاب میں شامل کی جائیں گی تاکہ طالب علم رموز کائنات کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو اور اس غلط فہمی میں نہ پڑے کہ یہ کارخانہ اپنے آپ چل رہا ہے۔ اور اسے مرنے کے بعد کہیں جواب نہیں دینا ہے۔

اس ضمن میں ایسی ۶۰ آیات کا انتخاب موجود ہے جو نباتات کے مختلف ابواب کے بارے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ رہنمائی دیتی ہیں۔^{۱۶} حیوانات کے مختلف ابواب کو بعض قرآنی آیات کی روشنی میں پڑھانے کے لئے ایسے خطوط دیئے گئے ہیں جن سے نفس معنوں۔ حقائق۔ اپنی جگہ رہتا ہے لیکن ان کو دیکھنے کا زاویہ نظر اسلامی تصور کے مطابق ہو جاتا ہے۔ کیمیا کی اسلامی نظریاتی تدریس کے لئے اصول پیش کئے گئے ہیں۔^{۱۷} اسی طرح طبعیات، ریاضی اور فطری علوم کے دیگر شعبوں کے بھی نصاب اسی طرح مرتب کئے جائیں گے ان کا علم، العلم کے حصول میں مددگار و معاون ہو۔

اطلاقی علوم

فطری علوم کے ذریعہ جو قوانین الہیہ علم میں آئے، ان کے اطلاق سے بہت سے ایسے علوم وجود میں آئے جو انسان کے فائدہ اور بہتری کے لئے ہیں اور جن کو اختیار کر کے انسان نے اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے بہتر سے بہتر حالات پیدا کئے۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے اور اللہ تعالیٰ

نے انسانی ذہن کو اتنی حیرت انگیز صلاحیت سے نوازا ہے کہ وہ اپنی ایجالات و اختراعات اور ان کے استعمالات پر خود حیران رہ جاتا ہے۔ یہ علوم زراعت، انجینئرنگ، میڈیسن، کامرس اور گھریلو امور وغیرہ ہیں۔

ان علوم کے نصابات کی اسلامی تشکیل میں دو بنیادی اصول کار فرما ہوں گے۔
۱۔ محض اطلاقی علم یا پیشہ کی تعلیم کو کافی نہ سمجھا جائے گا۔ ایک طالب علم کی پیشہ کی تربیت حاصل کرنے کے بعد، محض پیشہ در نہیں ہوتا بلکہ اسلامی معاشرے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے دیگر افراد اور اجتماع سے اس کے رابطے اور حقوق و فرائض ہوتے ہیں۔ اسی لحاظ سے خواہ مستقبل میں اس کا پیشہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس تعلیم کے ساتھ اسلامی اور عمرانی علوم کا ایک نصاب اس کے لئے مرتب کیا جائے گا۔ مختلف پیشوں کی رعایت سے اس کے موضوعات میں تنوع ہو سکتا ہے لیکن بنیادی مقصد پیشہ ور کی ایک مسلمان اور انسان کی حیثیت سے تعلیم درجیت ہے۔

۲۔ اطلاقی علم کی تمام شاخوں میں بذاتِ خود بھی نظریہ حیات کا اظہار ہوگا۔ میڈیسن کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے کہ اس کا عقیدہ سے کیا تعلق ہے لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے فنِ طب تک کو اس طرح مرتب کیا کہ طبی کتابوں کو آپ پڑھتے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عقیدہ رکھنے والی کسی قوم کی کتابیں ہیں۔

آغازِ خدا کی حمد سے کریں گے۔ دوائیں اس طرح منتخب کریں گے کہ اس کے اندر حرام اجزاء شامل نہ ہوں۔ حلال چیزوں سے نسخے مرتب کریں گے۔ جگہ جگہ بیج میں بیان اس طرح سے کریں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ ان دواؤں کے اصل خواص ذاتی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔ بیماریوں کی شفاء اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے اور ان دواؤں کا کارگر ہونا اللہ تعالیٰ ہی کی بدلت ہے۔ نبض پر ہاتھ رکھیں گے تو بسم اللہ کہہ کر رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں گے کہ رہنمائی فرمائیے۔ یہ ساری چیزیں کیا ہیں، فی الحقیقت فن تھا اور وہی معلومات تھیں جو دنیا کا کوئی طبیب فراہم کرے گا لیکن ان سب کو اپنی ذہنیت کے مطابق، اپنے عقیدہ اور طرزِ فکر کے مطابق انہوں نے ڈھالا۔ ۱۸

اسی طرح انجینئری ہے، کامرس ہے، زراعت ہے اور دوسرے فن ہیں۔ ہر ایک کے نصاب

سے جہاں اللہ تعالیٰ کے وجود کا احساس ہوگا، اس کی قدرت و حکمت کا شعور بیدار ہوگا۔

اس کی نعمت پر شکر کے احساسات بھی پروان چڑھیں گے کہ اس نے انسان کو یہ کچھ کرنے کی،
نائدہ اٹھانے کی، اور نفع حاصل کرنے کی سمجھ دی اور طریقے سکھائے۔

ادبیات و فنون

ان علوم کا تعلق انسان کے اظہار اور ابلاغ کی صفت سے تعلق رکھتا ہے۔ اللہ نے انسان کو
بونا سکھایا اور قلم کے ذریعہ علم عطا کیا اور انسان کو غنی صلاحیتوں کے خزانے عطا کئے۔ یہ علوم انہی
صفات کا اظہار ہیں۔ انہی کے ذیل میں سائنات آتی ہیں۔ زبان ذریعہ ہے جس سے خیالات منتقل ہوتے
ہیں۔ یہ خیالات کیا ہوں؟ یہ وہ میدان ہے جہاں مقاصد تعلیم کے حصول کو نصاب کے ذریعہ حاصل کرنے
کا عمل سب سے زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے۔

اسلامی تعلیمی نظام میں عربی کی اتنی استعداد ہر طالب علم کو ہونا چاہیے کہ وہ قرآن کریم کو پڑھ سکے اور
نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ سے اتنی عربی کی توقع کی جائے گی کہ وہ اس کا مفہوم بھی سمجھ لے۔ عربی کا اتنا علم اسلام سے
قریب لانے کا سبب بنے گا۔

زبانوں کا علم حاصل کرنے پر قید نہیں کوئی ملک اپنی ضروریات کے لحاظ سے اس بارے میں کوئی
بھی حکمت عملی وضع کر سکتا ہے لیکن اس کے لئے جو نصاب بنایا جائے گا وہ اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے
والا ہو اور تعلیمی مقاصد سے ہم آہنگ ہو۔

فنون کا دائرہ خصوصی طور پر ثقافت سے متعلق ہے۔ ہم یہاں اس کے صرف اس پہلو سے بحث
کریں گے جو اسلام سے متعلق ہے۔ اس کے تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہوئے ملک ملک میں تنوع کی
گنجائش ہے جو ضروری بھی ہے اور شاید مطلوب بھی۔

اپنی انتہا میں ثقافت کسی نظریہ حیات یا مقصود حیات کو محض لفظوں کے خشک پیرائے سے
بٹا کر اسے ایسا دلکش اور جاذب نظر پیرایہ اظہار بناتا ہے جس میں انسان کے پورے حواس بڑے کارآمد
جس میں پورا انسان شامل ہو۔ ۱۹

ثقافت زندگی کے تمام شعبوں میں پھیلی ہوئی ایک وسیع چیز ہے، اس کی مرکزی روح اخلاقی شعور

سے تشکیل پاتی ہے۔ کوئی بھی موضوع حیات اور رہنمائی بھی ہو سکتا ہے، اگر ثقافت کی مرکزی روح سے ٹکرائے یا اس سے تجاوز کرے تو وہ ثقافت کے دائرے سے خارج ہو کر پستی میں پھل جائے گا۔ ظہور اسلام سے قبل خانہ کعبہ میں بے شمار بت رکھے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے بعض کاریگری بت تراشتے بھی ہوں گے اور بتوں کی مانگ بھی ہوگی۔ اس معاشرے کے کچھ لطیف ذہن بت تراشی کو ذریعہ اظہار بناتے ہوں گے۔ بت پرستی ان کا مسلک تھی اس لئے اس کا اظہار ایک مخصوص ثقافتی و معاشرتی عمل میں ہونا تھا۔ اسلام نے زندگی کا جو تصور دیا اس میں بت پرستی کی نیک کنی کی گئی۔ اس لئے عربوں کی فنکارانہ صلاحیت نے بت تراشی سے منہ موڑ لیا۔ اس مثال سے ہم نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی تعلیم میں فنون کے مضامین کے معنی اور ان کے مضامین میں عقیدہ کا فرما ہوگا اور اس عقیدہ کے زیر اثر جو اقدار ہیں ان کی مطابقت ہوگی۔ آزادی ضرور ہوگی لیکن بے راہ روی نہ ہوگی ثقافت کا مقصد جنسی ہیجان نہ ہوگا کہ اعلیٰ اجتماعی مقاصد سے بے پروا ہو کر انسانی جسم بالخصوص عورت کے جسم اور اس کی نمائش کو ثقافت کا مرکزی نقطہ قرار دیا جائے اور حقیقت بندی کے نام پر ہر قسم کی بستی اور پراگندگی کا جواز تلاش کیا جائے۔ اسلامی مملکت کا اپنا واضح ثقافتی اسلوب ہوگا اور نظام تعلیم میں متعلقہ مضامین اسی کا مظہر ہوں گے۔

اب تک کی بحث ہم نے نصاب کے بارے میں اس مرکزی نکتہ کی تفہیم کے لئے کی ہے کہ ہر قسم کے علوم کے بنیادی تصورات میں اسلامی فکر ہوگی اور مضامین کی تشکیل میں اسے پیش نظر رکھا جائے گا۔ اس پر زیادہ تفصیل سے اس لئے بحث کی گئی ہے کہ یہ دراصل وہ بنیادی تبدیلی بھی ہے جو رائج الوقت نصابوں میں لانی ہے۔ ہم نے کوشش کی کہ اس کے خطوط کار واضح ہو جائیں۔

ہدایتِ خود اسلام غور و فکر اور عقل و تفکر کا مذہب ہے۔ ساتویں سے تیرھویں صدی تک انسانی تمدن کا علمی عروج مسلمانوں کا ہی رہا ہے اور اگر آج بھی مسلمان نوجوان اپنے نظام تعلیم کے تحت تربیت پائیں تو تخلیقی قوتوں کے وہی سوتے پھوٹ سکتے ہیں جو انہیں تحقیق و اختراع کے میدان میں آگے لے جائیں۔ مضامین کے ضمن میں اس مرحلہ پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلامی نظام تعلیم میں تمام علوم میں جدید ترین تحقیقات سے حاصل کردہ حقائق لازماً شامل ہوں گے۔ مثال کے طور پر حیاتیات کی جدید ترین تحقیقات شامل نصاب ہوں گی لیکن اس حقیقت سے نہیں کہ یہ سہل ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں سب کچھ آپ ہی آپ ارتقاء پا کر ظہور پذیر ہو گیا ہے۔ اس طرح دیگر تمام علوم میں — اگر کسی کے ذہن میں

یہ خیال آتا ہے کہ اسلام بذات خود ان حقائق کا منکر ہے — مثلاً چاند پر انسان کے جانے کا — تو یہ کم نہیں اور اسلام کے ساتھ نادان دوستی ہے یہ ہماری بد قسمتی ضرور ہے کہ تحقیق و اختراع کا میدان مغرب کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس سے منکر ہو جائیں۔ یہ تو ہمارے لئے دراصل ہمیں یہ کہ دراصل یہ کام ہم مسلمانوں کے کرنے کے ہیں۔ موجودہ صورت حال میں ہمیں صرف اسلام کا بچنا ہوا وہ اختیار تیزی استعمال کرنا ہے کہ لینے والی چیز لی جائے اور نہ لینے والی چیز نہ لی جائے۔

معاشرہ

نصاب کا معاشرتی تقاضوں سے ربط، اسلامی نظام تعلیم میں بنیادی حیثیت رکھے گا بصورت دیگر مقاصد تعلیم کے حصول کا سوال ہی نہیں۔ اگر کسی نظام تعلیم میں، محض قرآن کی تفاسیر اور احادیث کے ماہرین پیدا کئے جائیں تو یہ کسی اسلامی مملکت کا نظام تعلیم نہیں کہا جاسکے گا۔ ملک اور معاشرہ کی ضروریات کی تکمیل میں نصاب تعلیم اپنا کردار ادا کرے گا۔

معاشرتی تقاضوں کا ایک پہلو تعلیم کو معاشرتی تبدیلی لانے کے وسیلہ کی حیثیت سے استعمال کرنا ہے۔ حضور نے صحابہ کی تعلیم و تربیت سے جو عالمگیر اور تاریخی انسانی کا دور رس انقلاب برپا کیا وہ تعلیم کے اس تصور کی صداقت کا ثبوت ہے۔

اگر ہم قرآن کے تصور تعلیم کو سمجھنا اور اپنانا چاہتے ہیں اور اس کردار کی جھلک اپنے آس پاس دیکھنا چاہتے ہیں جسے قرآن پسند کرتا ہے تو ہمیں معاشرے اور تعلیم کو مربوط کرنا پڑے گا۔ نئے مثال کے طور پر اگر آپ حیا داری اور جنسی پاکیزگی کو اپنی نسلوں میں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کا درس دینے وقت معاشرے کی صورت حال کو زیر بحث لانا ہوگا، اگر اس میں جنسی پاکیزگی کم ہو رہی ہے حیا و حجاب کا چلن اٹھتا جا رہا ہے تو آپ کو اس کے اسباب و محرکات پر روشنی ڈالنا ہوگی اور اگر حکومت یا سیاسی اداروں کی خواہش کے خلاف اسباب محرکات اپنی جگہ قائم ہیں تو نئی نسلوں کو مطمئن کرنے کے لئے اور ان کو حیا اور جنسی پاکیزگی سے وابستہ رکھنے کے لئے وہ راہیں سمجھانا ہوں گی جن سے ناپسندیدہ احوال کی علماً اصلاح ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اگر معاشرے میں لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا بازار گرم ہو اور بعض طاقت ور طبقے اپنے دائرہ اختیار اور وسائل کی مدد سے کمزور طبقوں پر مسلسل ظلم ڈھا رہے ہوں تو نئی نسل کو معاشی

نصاب کی تعلیم دیتے وقت ان احوالِ واقعی کا بیان ناگزیر ہے اور بیان اس وقت مؤثر اور بامعنی بنتا ہے جب کس برائی کو دور کرنے اور اس پر قابو پانے کے وسائل سامنے لائے جائیں۔

موجودہ دور میں یہ اور ایسے دوسرے مسائل مسلم اقوام کے مسائل ہیں۔ نصاب سازی کرتے ہوئے ان مسائل سے آگہی اور ان کا واضح شعور بھی ضروری ہے اور ہمارے بھی کہ ان کو نصاب میں کسی سطح پر کن مضامین کے ذریعے شامل کیا جائے۔

معاشرتی تقاضوں کا دوسرا پہلو اسی خاص ملک کی جس کا وہ نظامِ تعلیم ہے تاریخ، اس کا نظریہ، اتحاد قومی کے عوامل، اہم ملکی مسائل اور چیلنج وغیرہ کو نصاب میں سمونے کا عمل ہے۔ دنیا کی ساری قومیں اپنی تعلیم کے ذریعے اپنی نئی نسل کو اپنی قوم سے وابستگی کا شعور دیتی ہیں بعض مضامین مثلاً تاریخ، جغرافیہ، مدینت وغیرہ اس کے لئے خصوصی طور پر مؤثر ہیں معاشرتی علوم کے مضمون کے تصور کو لازمی تعلیم کی سطح تک کے لئے اپنایا جائے تو اس کے ہر سطح کے نصاب بنائے جائیں گے جن میں غور و فکر کر کے ایسے مفید عناصر شامل کئے جاسکتے ہیں۔ زبان کا نصاب بھی اس کے لئے بہت مؤثر طریقہ سے استعمال ہو سکتا ہے۔ مسلم ممالک کے ان نصابات میں محدود نقطہ نظر سے قوم پرستی کے بجائے وسیع پس منظر میں امت سے وابستگی اور اپنے ملک سے تعلق کو پروان چڑھایا جائے گا۔

معاشرتی تقاضوں کا تیسرا پہلو قومی منصوبہ بندی سے تعلق رکھتا ہے۔ آج کا ذہن منصوبہ بند ذہن ہے۔ ہر قوم پانچ پانچ دس دس سال نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ مدت سامنے رکھ کر اندازہ لگاتی ہے اور اس کے مطابق محققین، سائنسدان، استاد، انجینئر، ڈاکٹر، ماہرین امورِ خانہ داری یا دیگر پیشوں کے ماہرین کو تربیت دینے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ دوسرا سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ وسیع صنعت و حرفت اور وسیع تجارت کا دور ہے۔ بہتر ہتھیاروں کی تیاری زیادہ مفید علوم میں دسترس سب کے پیش نظر ہے۔ نظامِ تعلیم اپنے اداروں کے ذریعے وہ تنظیم فراہم کرتا ہے جہاں یہ افراد تربیت یا سکس اور نصاب کی تشکیل میں قوم کی حقیقی ضروریات کو پیش نظر رکھا جائے گا تاکہ تعلیم حاصل کرنے والا فرد مرد ہو یا عورت معاشرہ کی مفید خدمت انجام دے سکے۔

موجودہ دور میں یہ پہلو اسلامی ممالک کے لئے اس لئے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک سے دوڑ اسی میدان میں ہے اور اس کا حل ایسا نظامِ تعلیم ہے کہ ہر شخص ہر مند ہر پید آوری

کوشش میں شریک تاکہ ملک کو صنعتی بنیاد فراہم ہو سکے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملک کا بوجھ بٹانے کے بجائے ملک کے لئے بوجھ بن جانا، اپنی ضروریات کی فہرست کو طویل کر لینا لیکن پیداواری عمل میں حصہ دار بننے کے بجائے بس میز کر سی بٹھانا معاشرہ کو منفعت خوروں اور پابجوں کا معاشرہ بنا دیتا ہے۔ یہ اسلامی تصور کے خلاف ہے اور مسلم ممالک کو پسماندگی کا سبب۔ اس لئے نظام تعلیم میں ایسے متنوع کورس ہونا چاہیے جس میں تعلیم حاصل کر کے طالب علم ہنرمند ہو اور اپنے دہانتوں سے روزی بھی کمائے اور ملک کی ترقی میں شرکت کی خوشی میں حاصل کرے

فرد

اسلامی معاشرہ میں فرد کی اپنی اہمیت ہے۔ دنیا کی بعض دوسری تہذیبوں کی طرح نہ یہ خود مختار و آزاد ہے اور نہ ریاست کے ہاتھ میں مجبور شخص اور ایک کٹھ پتلی مدہ نلیفہ اللہ ہے اور آزمائش کے لئے دنیا میں پھنپایا گیا ہے۔

فرد کی کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ اللہ کا بندہ ہے امت مسلمہ کا ایک فرد ہے۔ اپنے ملک کا شہری ہے۔ اپنے شہر اور علاقے کا باشندہ ہے۔ اپنے خاندان کا ایک فرد ہے اور مرد ہو یا عورت فرائض اور حقوق اور ایک کردار رکھتا ہے اور پھر اس کی اپنی ذات بھی ہے۔ اس کی ہر حیثیت کا تقاضا ہے کہ اس کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت ہو اور اسلامی نظام تعلیم اس کے لئے رحمان طبع کے مطابق حصول علم، مہارت پیشہ اور جذبات و میدانوں کی تہذیب و تربیت کے مواقع فراہم کرے۔

نظریہ اور معاشرہ کی جو حیثیت اور پرگندری ہے اس سے زیر بحث نکتہ کے کئی پہلو واضح ہو چکے ہیں۔ یہاں اس پہلو کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو اسلامی نظام تعلیم کا مابہ الامتیاز ہے اور یہ فرد کی اور مرد ہونے کی حیثیت ہے۔

اسلام میں طلب علم کی فرضیت مسلمان مرد اور عورت کے لئے یکساں ہے اور ایک انسان ہونے کی حیثیت سے علم کا بہت سا سرمایہ دہ ہے جو ان کے لئے مشترک اہمیت کا حامل ہے لیکن دین کے تقاضوں، معاشرت کی اسلامی اقدار قومی ضروریات اور خود عورت کی شخصیت و نفسیات کا یہ مطالبہ ہے کہ اس کی تعلیم کے لئے مختلف طرز پر انتظام کیا جائے تاکہ تعلیم کا ضروری، مفید اور کارآمد ہونے کا تقاضا پورا ہو سکے۔

مختلف مراحل کے لئے نصاب

نصاب کا تعلق اس مسئلہ سے بھی ہے کہ کس مرحلہ پر کون سے مضامین کس معیار پر پڑھائے جائیں۔ اصطلاحاً جبے ایکم آن انڈسٹریز کہا جاتا ہے یہ کسی ملک کے تعلیمی اداروں کے نظام سے براہ راست منسلک ہوتی ہے۔ اس کی تفصیلات کسی بھی دور میں کوئی ملک اپنی منصوبہ بندی کے لحاظ سے کرتا ہے۔

موجودہ حالات میں مسلم ممالک کے عمومی تقاضوں کے پیش نظر یہ ایکم کچھ اس طرح ہو سکتی ہے کہ

۱۔ آٹھویں جماعت یا میٹرک کے مرحلہ تک کے لئے مفت لازمی تعلیم ہو۔

۲۔ پانچویں جماعت تک کے بچوں اور بچیوں کے لئے بالکل یکساں نصاب ہونا چاہیے۔

تعلیمی ادارے بہتر ہے کہ تیسری جماعت کے بعد علیحدہ ہوں۔

۳۔ تیسری جماعت تک کے نصاب میں قرآن پاک کی ناظرہ، تعلیم کا قومی زبان میں نوشتہ

خواندہ، سیرت کے واقعات، دینی معلومات، ابتدائی سائنس، مسواک اور برش کا ہتھوڑی

کا استعمال وغیرہ ہو سکتا ہے۔

۴۔ پانچویں جماعت تک کے نصاب میں قرآن کے منتخب حصے ترجمہ کے ساتھ سیرت اور

اسلامی تاریخ کا بنیادی علم، سائنس، زبان، حساب، نماز کی تربیت کسی بہارست کی

ابتدائی تربیت وغیرہ ہو سکتا ہے۔

۵۔ آٹھویں جماعت تک کے نصاب کے مرحلہ میں طالبات کے لئے علیحدہ نصاب کا

آغاز کر دیا جائے نصاب کا ایک حصہ مشترک ہوگا اور ایک خصوصی برائے طلبہ اور ایک

خصوصی برائے طالبات۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ ایک بڑی تعداد اس کے بعد

شاید تعلیم جاری نہ رکھے، اس مرحلہ میں دینی تعلیم، قومی تاریخ، قومی شخصیات ملک کا جغرافیہ

اور حالات، سائنس، ریاضی کے کسی ایک جز میں ضروری تربیت کا اہتمام کیا جائے، طلبہ طالبات

کے لئے ہنر منتخب کرنے کی علیحدہ فہرست ہوگی نیز درسی کتب کے بعض حصے بھی علیحدہ

ہو سکتے ہیں۔

۶۔ دسویں یعنی ثانوی جماعت میں طلبہ و طالبات کو آئندہ زندگی کے منصوبہ کے لحاظ سے

انتخاب کے مواقع موجود ہوں گے۔ بنیادی علوم کے ساتھ اس مرحلہ کی اصل خاصیت یہ ہوگی کہ ان کو کسی نہ کسی فن میں اتنی تربیت دی جائے گی کہ وہ معاشرہ کے کارآمد شہری بنیں، فنِ تعلیم کی کسی کتاب میں اس نوعیت کی فہرست دیکھی جاسکتی ہے۔

۷۔ اعلیٰ ثانوی مرحلہ میں مستقبل کے متوقع خصوصی میدان کے پس منظر کے لئے تعلیم دی جائے گی۔ ایک مشترک نصاب ہوگا۔ جس میں اسلامیات، قومی تاریخ، قومی زبان کے مضمین ہوگا جن کی تفصیلات میں طلبہ و طالبات کے لئے اختلاف ہو سکتا ہے۔ دوسرا نصاب متوقع میدان کے لحاظ سے ہوگا۔ جس میں یہ لحاظ رکھا جائے گا کہ اس مرحلہ پر اتنا اختصاں نہ ہو جائے کہ آئندہ انتخاب کا میدان بالکل محدود ہو جائے۔ حالات کے لئے ایک بہت بڑا متوقع میدان گھرداری کا ہوگا۔

۸۔ اعلیٰ ثانوی کے بعد اعلیٰ تعلیم کے نصابات ہوں گے جو مذکورہ خطوط کی روشنی میں مرتب کئے جائیں گے۔ ان سب مراحل میں ایک مشترک نصاب رہتا جائے جو متعلقہ مرحلہ کے معیار سے اسلامیات، قومی مسائل اور قومی تعلیم کا ہوا در دوسرا حصہ پیشہ ورانہ تربیت کا۔ بعض پیشہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ہوں گے۔ علیحدہ اداروں میں ایک جیسا نصاب پڑھایا جاسکے گا۔ بعض پیشہ مردوں کے لئے خاص اور بعض عورتوں کے لئے خاص ہونا چاہیئے اور ان کی تربیت کے انتظامات ہونا چاہیئے۔

ان خطوط پر کسی ملک کے نصابی ادارہ کو اپنے حالات و ضروریات کے لحاظ سے نصابات کی تدوین کا کام سرانجام دینا چاہیئے۔

نصاب کی بحث کے اختتام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ نصابات کی روایتی بحثوں سے دانستہ احتراز کیا گیا ہے مثلاً یہ بات کہ نصابات میں انقی اور متوازی ربط ہو، تسلسل ہو، وغیرہ ان کے بارے میں یہ اصول بیان دینا شاید کافی ہو کہ اس میدان میں تحقیقات کے نتیجے میں جو نئے اصول وضع کئے جائیں ان کو حالات کے مطابق اختیار کیا جائے۔ صرف یہ خیال رکھا جائے کہ اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف کوئی طرزِ عمل یا حکمتِ عملی قابلِ قبول نہ ہوگی۔

۴۔ کتاب اور تدریسی آلات

درسی کتاب بھی نظام تعلیم کا ایک اہم تشکیلی عنصر ہے۔ نصاب کی تدوین کے بعد دوسرا مرحلہ اس کے مطابق درسی کتب کی تالیف و تصنیف کا ہوتا ہے۔ بالعموم اعلیٰ ثانوی مرحلے تک منظور شدہ درسی کتب استعمال کی جاتی ہیں اور بعد کے مراحل کے لئے نصاب کے موضوعات کے مطابق متعدد کتب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ایک ہی علم ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ ثانوی ڈگری اور ماسٹر کی سطح پر طالب علم کی ذہنی، نفسیاتی اور اخلاقی ارتقاء کے معیار کے مطابق پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کتابیں ایک مخصوص تکنیک سے لکھی جاتی ہیں اور توقع کی جاتی ہے کہ اساتذہ اس تکنیک کو سمجھتے ہوں تاکہ وہ اسباق کے مضمرات اور دوسرے شتملات سے ان کے ربط کو محسوس کر سکیں اور مخصوص فنی، ذہنی، جذباتی یا نظریاتی نقطہ نظر سے اس کے لوازم اور اس کی ظاہری شکل کے مفید اور موثر ہونے کا اندازہ کر سکیں۔ درسی کتب کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے لئے راہنما اور اعدادی کتب بھی تیار کی جاتی ہیں۔ کسی اچھے تعلیمی نظام میں جہاں فرض شناس اساتذہ قیلم دیتے ہوں اور انہیں یہ فکر ہو کہ زیر تعلیم طلبہ کے اندر وہ معیار ضرور پیدا ہو جو نصاب سازوں کو مطلوب ہے ان کتب کی بڑی اہمیت ہے۔ نصاب تشکیل دینے والے اور اس کے مطابق درسی کتب تیار کرنے والے نو چند ہوتے ہیں جنہیں اجزا نصاب کی حکمت معلوم ہوتی ہے لیکن اسے پڑھانے والے ہزاروں اساتذہ ہوتے ہیں۔ یہ کتب ان کی تفصیلی راہنمائی کرتی ہیں تاکہ اس طرح طلبہ کے لئے کسی کتاب کے اجزاء میں نشین کرنے کا عمل اس کے بغیر ممکن نہیں کہ وہ اس پر اچھی طرح مشق کریں۔ یہ مشقیں متفرق طور پر کروائی جائیں تو وہ فائدہ نہیں ہوتا جو کسی ایک کتاب کی ایک ہی ورک بک کے مطابق کرانے سے ہوتا ہے۔ ان کتب کی تیاری اور استعمال تدریس کی حکمت اور مہارت کا لازمہ ہے اور اسلامی نظام تعلیم میں ان کی تیاری اور استعمال میں کسی درسی کتاب کے فوری مقاصد کے ساتھ ساتھ مجموعی مقاصد کے حصول کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا۔

مقاصد تعلیم اور درسی کتب کے اس تعلق کو سمجھ لیا جائے تو نظریاتی نظام تعلیم میں درسی کتب کی غیر معمولی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اس کی حیثیت ایک اہم اور موثر ہتھیار کی ہے۔ اگر مقاصد تعلیم نظریاتی بیان کر دیئے جائیں، بالفرض نصاب بھی ایک حد تک نظریاتی تشکیل دے دیئے جائیں لیکن درسی

کتب نظریاتی نہ ہوں تو شمس الدین کے حصول میں تاکائی یعنی ہوجاتی ہے۔ لیکن اسلامی مملکت میں خطرہ کبھی مول نہ لے گی اور درسی کتب کے لئے ایسا نظام بنائے گی کہ ان کی حاسد کے مطابق تیاری ایک یعنی امر ہو۔ قدرتی بات ہے کہ مفاہیم تعلیم اصولاً یکساں ہونے کے باوجود مقام مسلمان ممالک کے لئے یکساں درسی کتب نہ ہوں گی۔ اس لئے کہ ہر ملک کے حالات اور پس منظر مختلف ہے لیکن کسی ایک مسلمان ملک میں یہ مناسب ہوگا کہ پورے ملک کے لئے یکساں درسی کتب استعمال میں آئیں اور ایک ہی ادارہ ان کی تیاری کا ذمہ دار ہو یا مختلف علاقوں میں علیحدہ ادارے اپنے لئے درسی کتب تیار کریں۔ اس سوال کا صحیح جواب تو ہر ملک کی عملی صورت حال میں مختلف ہو سکتا ہے لیکن انہی بات کہی جاسکتی ہے کہ نظریاتی مملکت کا رجحان یہ ہونا چاہیے کہ اس کی حدود میں رائج کتب یکساں ہوں۔ مرکزی ادارہ نصاب سے ملحق یا اس کی نگرانی میں اور مشورے سے کام کرنے والا ادارہ درسی کتب کا ذمہ دار ہو۔

اہم ترین بات یہ ہے کہ ان کتب کی تیاری میں شریک افراد نہ صرف اپنے مضمون اور درسی کتب لکھنے کے فن سے خوب اچھی طرح واقف ہوں بلکہ ان کا نظریاتی و فنی شعور بھی اتنا گہرا ہو کہ ان کے فہم سے ایسی کتاب نہ لکھی جاسکے جو اپنی تفصیلات میں نظریاتی و فنی مقاصد کے کسی بھی طرح خلاف جانی ہو۔ ان کی ہمارے اس کام آئی چاہیے کہ وہ مضمون کے نصابی معیار کو انتہائی مناسب انداز سے نظریاتی آہنگ دیں۔ اگر کتاب میں نظریہ حیات کو جوڑے انداز سے پیش کیا گیا تو اس سے بھی مقصد حاصل نہ ہوگا۔ نظریاتی نقطہ نظر سے دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان کتب کی طباعت و پیشکش انتہائی باارز نظر اور خوبصورت ہونا چاہیے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ طالب علم کتاب پڑھیں تو کتاب ایسی ہو کہ ہاتھ میں لینے کو اور پڑھنے کو اور احتیاط سے رکھنے کو دل چاہے۔ اعلیٰ طباعتی معیار سے لوازم کو مناسب انداز سے پیش کرنا اور سہولت سے ذہن نشین ہونا بھی ممکن ہوگا اور اس سے تعلیمی معیار بہتر ہوگا۔ اس کے علاوہ حسن کاری ایک اسلامی اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے۔ درسی کتب کو غیر معیاری اور جلدے انداز سے پیش کرنا ایک غیر اسلامی فعل کہا جاسکتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ درسی کتب میں نصابی تبدیلی اور اساتذہ و طلبہ کے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں برابر تبدیلیاں ہو سکتی ہیں لیکن یہ کارروائیاں بلا ضرورت نہ ہونا چاہئیں۔ تین سال یا پانچ سال کی کوئی ایسی مدت مقرر کر لی جائے جس سے پہلے پہلے غور و فکر مکمل کر کے تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں اور

نظام میں کسی اختلاف کے بغیر دوسری کتب رائج ہو جائیں۔

ان تین عمومی باتوں کے علاوہ اسلامی نظام تعلیم میں درسی کتب کی نیاری میں ان امور کو پیش نظر

رکھا جائے۔

نظریاتی

۱۔ درسی کتب اسلامی نظام تعلیم کے مقاصد اور نصاب اور اس کے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر تیار کی جائیں۔

۲۔ درسی کتب میں العلم (الہامی علم) اور کتابی علوم میں ربط قائم رکھا جائے تاکہ طالب علم کا ذہن حقیقت آشنا ہو اور اسلام کے تصور کائنات و انسان کی صحیح تفہیم اسے حاصل ہو۔ ایمان اور عقل کے تقاضوں میں ربط اور ہم آہنگی کی حقیقت اسباق سے مترشح ہو۔

۳۔ اسلامی نظریہ حیات کو مضمون اور اس کی متعلقہ سطح کی مناسبت سے نظری انداز سے لیکن انتہائی اعتماد سے پیش کیا جائے۔ انداز نہ مدافحانہ ہر گاہ نہ معذرت خواہانہ،
۴۔ درسی کتب میں استعمال کے لئے مختلف خطوں کے لئے ذخیرہ الفاظ سے استفادہ کیا جائے جس سے اسلامی اقدار کا اظہار ہوتا ہو۔

۵۔ درسی کتب کا مجموعی تہذیبی پس منظر اسلامی ہو۔ صرف سائنات و ادب سے ہی نہیں ہر کتاب سے، حتیٰ کہ ریاضی کی کتاب سے بھی تہذیب و معاشرت کی عکاسی ہر تہذیبی عبارت سے کلمات و سوالات میں کس طرح کے تضادات پیش کئے گئے ہیں، اس کے علاوہ بھی دیگر کتابوں میں ناموں، مثالوں، قصوں اور کہانیوں اور علامتوں کے انتخاب سے مسلمانوں کے اپنی تہذیب و تمدن کا اظہار ہو۔

فنی

۶۔ لوازم میں معیار کے ان فنی ربط کا لحاظ رکھا جائے یعنی درسی کتاب کا ہر حصہ سابقہ حصہ

پر مبنی اور اس سے متعلق ہو۔

۷۔ کتاب میں مضمون کو داسخ اور قابل فہم بنانے کے لئے نقشے اور ٹیکس اور تصاویر مختلف رنگوں میں استعمال کی جائیں۔

۸۔ کتاب کی زبان، طالب علم کی عمر و فہم کی سطح کے مطابق ہو۔

۹۔ ذہن نشین کرنے کے لئے حکمران کا اصول اختیار کیا جائے۔

۱۰۔ ہر بات کے آخر میں خلاصہ دیا جائے۔

۱۱۔ ہر بات کے آخر میں اس پر سوالات مرتب کئے جائیں گے اور اس ذریعہ سے بھی اسلامی پہلو کو داسخ کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۲۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ ہوں گے۔ اس میں مضمون سے متعلق عنوانات کے علاوہ اسلامی اصطلاحات کو بھی شامل کیا جائے۔

۱۳۔ درسی کتب میں مضمون اور لوازمہ کی نوعیت کے لحاظ سے آیات قرآنی، احادیث رسول اللہ، تاریخ اسلام سے واقعات، سائنس میں مسلمانوں کی خدمات سے لوازمہ نفس مضمون سے مربوط شکل میں شامل کیا جائے۔

۱۴۔ درسی کتب جس ملک کے لئے ہوں گی، اس کی تاریخ، فوجی ہیئر، مضامی، ترقی پس منظر سے ایسا لوازمہ شامل کیا جائے جو اسلامی اقدار کے مخالف نہ ہو۔

۱۵۔ درسی کتب کی معاون کتب یا اعلیٰ سطح کے لئے مجوزہ کتب بھی انہی خطوط پر لکھی گئی ہوں گی۔

اسلامی نظام تعلیم میں ایسی درسی کتب استعمال کی جائیں گی جن میں درج بالا اصولوں کا لحاظ رکھا گیا ہو ایسی کتب کا استعمال طلبہ میں اس ذہن، فکر اور کردار کا باعث بنے گا جو اسلامی معاصر کو مطلوب ہے۔

درسی کتب کے علاوہ بھی طالب علم کتاب میں پڑھنا سیکھ کر اس کے لئے ایک بالکل نئی دنیا کے دروازے کھل جائے ہیں اور جس زبان میں اس نے سیکھا ہے اس کی کتب اسے اپنے کو پڑھنے کی ادران سے اتر لینے کی دعوت دیتی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ اصطلاحی طور پر یہ نظام تعلیم کا جزو

نہیں، لیکن زیر تعلیم نسل پر اس کے اثرات کی اہمیت کی وجہ سے اس کے بارے میں کچھ ضروری باتیں اسلامی نظام تعلیم کے ذمہ داروں کے سامنے رہنا چاہئیں۔

کتاب کاغذ پر چھپی ہوئی تحریر کا نام نہیں۔ کتاب زندگی کے حقائق کو جاننے، مسلسل جاننے اور اس جان کاری کو دوسروں تک پہنچانے کا نام ہے تاکہ اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، اس میں مزید گیرائی پیدا ہو۔ کتاب علم کی حفاظت اور ترسیل کا نام ہے۔ کتاب وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے پہلی نسلوں کی محنت و کوشش، دانش و بینش اور حکمت و بصیرت کی نسلوں تک منتقل ہوتی ہے تاکہ وہ اس کے آئینے میں اپنے ماضی کو دیکھ کر اپنے مستقبل کی تعمیر کر سکیں۔ ”کتاب ہمیشہ سے اہم رہی ہے لیکن ادھر خد صدیوں سے جب سے انسان نے چھاپنے کی مشین ایجاد کر لی ہے اور اس کی بدولت کتاب کی چھپائی اور ترسیل کے طور طریقوں میں ایک حیرت انگیز انقلاب برپا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے کتاب کی اہمیت و قوت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔“

کتاب اتنا مؤثر ہتھیار ہے کہ مسلمانوں کی کوئی قیادت اسے غیروں کے ہاتھ میں دینا گوارا نہیں کر سکتی۔ امت مسلمہ کی بدقسمتی ہے کہ مغربی تہذیب اس ہتھیار کو اس کی نئی نسل کے خلاف اطمینان سے استعمال کر رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی کنائیں اور اپنی اچھی کتابیں نہیں لکھ رہے ہیں۔ اس طرح خلا پیدا ہوتا ہے اور یہ ایسی کتابوں سے پُر ہوتا ہے جن کا مقصد مسلمانوں کی نئی نسل کو ذہنی مہذبیت کا شکار کرنا اور انہیں اپنے عقائد اور جڑوں سے کاٹ دینا ہوتا ہے، آج مسلم قومیں دانتے یا نادانتے اپنے ان دشمنوں کے لئے منڈی بنی ہوئی ہیں جو کنائیں پیدا کرنے میں طاق ہیں باہر سے آیدالی ان کتابوں نے مسلمانوں کی تہذیب ولسانیت پر کہیں چلتے چلتے اور کہیں کھلم کھلا حملے کئے ہیں۔ لیکن ہم ان کی مداخلت کے قابل نہ تھے۔ زندہ قوموں میں کتابوں کی آمد و رفت دو طرفہ ہوتی ہے لیکن ہمارے ہاں یہ ٹریفک یک طرفہ ہے۔

نئے دور کی اسلامی مملکت اس صورت حال کے اسباب و عوامل پر غور کرے گی اور ایسا لائحہ عمل مرتب کرے گی کہ کم سے کم اس کی نئی نسل کے لئے اس کے عقائد اس کی ارتقاء، اس کے قومی ہیرو اس کی سائنسی ترقی پر ایسی لاتعداد کتابیں دیا کریں جو بیک وقت حقائق افزہ، خیال انگیز ہوں اور جو اس قابل ہوں کہ نئی نسل کے ذہنوں اور دلوں کو گرمائیں، انہیں اپنی طرف کھینچیں، انہیں

اپنے اندر جذبہ کر سکیں۔ اگر ہمارا نظریہ حیات ہماری نئی نسل تک نہ پہنچا تو ہمارے مستقبل کے بارے میں ددراٹیں نہیں ہو سکتیں

نصاب کی تفہیم کے لئے کتب کے ساتھ ساتھ تدریسی آلات بھی ہیا کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی اسلامی نظام تعلیم کا جزو ہوں اور ان کے بنانے میں اسلامی اقدار کو ملحوظ رکھا جائے۔

۵۔ ہم نصابی سرگرمیاں

(Co-Curricular Activities)

نظام تعلیم کے تکنیکی عناصر میں ہم نصابی سرگرمیوں کو ایک ایسا مقام حاصل ہے جس سے نظریاتی نظام تعلیم نہ صرف یہ کہ صحت نظر نہیں کرتا بلکہ اسے مثبت طور پر مقاصد تعلیم کے حصول میں معاون تصور کرتا ہے۔ ماہرین تعلیم کی نظر میں تعلیم صرف کتابی عمل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عملی سرگرمی بھی ہونی چاہیے اور جو نظریہ تعلیم کو صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ تعلیم ذریعہ قرار دیتا ہو اس کے لحاظ سے نظام تعلیم کا یہ عنصر نصاب کتاب سے کم اہم نہیں رہتا۔ اس کی تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ یہ وہ ”مناغل و مصروفیات ہیں جن میں عملی حصہ لے کر طلبہ اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر سکیں۔“ ۲۲

شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشوونما اور وہ بھی ایک مخصوص نظام اقدار کے حوالے سے اس صورت میں ممکن ہے جب ان سرگرمیوں کا مزاج ان تہذیبی اقدار کو نشوونما دیتا اور پروان بڑھاتا ہو جن کا نصاب درسی کتب اور استاد کی شخصیت کے روپ میں طالب علم مطالعہ کرتا ہے (اور عیاں کہ اس مطالعہ میں متعدد بار واضح کیا گیا ہے) اس میں کامیابی بھی اسی صورت میں ممکن ہے جب معاشرہ میں چلن بھی انہی اقدار کا ہو)۔ سرگرمیاں انجمنی تقریبات، کھیل اور تفریح کی شکل میں ہوتی ہیں اور ان کی نوعیت اس پر منحصر ہوتی ہے کہ کرنے والے کس قسم کی اقدار کی ترویج نئی نسل میں کرنا چاہتے ہیں۔ ان سرگرمیوں سے، ان کے انعقاد کی تیاریوں سے، انعقاد سے اور بعد میں ان پر گفتگو اور تبصروں سے ایسا جیتا جاگتا ماحول تشکیل پاتا ہے جو طالب علم کی عادات و اطوار، پسند و ناپسند اور سوچ اور فکر پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اسلامی نظام تعلیم میں بنیادی قدر خود اسلام ہے جس کے گرد پورا نظام رواں دواں رہتا ہے۔

ہم نصابی سرگرمیاں بھی اسی نظام کا حصہ ہونے کی وجہ سے اس دائرہ سے باہر نہیں ہیں لیکن جدید دور میں مغرب کی لذت پسند اور عالم دوبارہ نیست کی بنیاد پر استوار تہذیب نے ان سرگرمیوں کا ایسا مزاج اور رخ متبدل کر دیا ہے کہ ان کے بارے میں اسلامی تصور تفہیم کی ضرورت خود مسلمانوں کو بھی ہے۔

یہ سرگرمیاں کچھ بھی ہوں، ان کی تہ میں ثقافتی اقدار ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق نظام عقائد سے ہوتا ہے۔ ہم جن باتوں پر یقین رکھتے ہیں جن انکار و اعمال کو پسند کرتے ہیں اور جن امور کی انکاریت کے قائل ہیں، شعوری یا غیر شعوری طور پر ثقافتی اقدار انہی کے سانچے میں طے ہوتی ہیں۔ جیسا کہ بہادری، غیرت، خوانین کی عزت، ضبط نفس، ایثار، بڑوں کا احترام، چھوٹوں سے شفقت، جنسی بے راہ روی سے پرہیز یہ محض اعلیٰ اخلاقی اقدار نہیں بلکہ وہ اسلامی اقدار ہیں جو ایک اسلامی معاشرہ میں پائی جانا چاہئیں لیکن دوسری طرف مغرب کے معاشرے میں جہاں مفاد پرستی اور لذت پرستی اور جنسی بے راہ روی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ہم نصابی سرگرمیوں کا ایک پہلو تفریح کا بھی ہے۔ تفریح فطری خواہش ہے اور تعلیم گاہوں میں تو تعلیم و تربیت کا مؤثر ذریعہ ہے۔ لیکن تفریح کے ذریعے ذہنی انتشار پیدا ہو، اور صلاحیتوں کو زنگ لگے تو یہ صحت مند تفریح نہیں۔ بد قسمتی سے جنسی تلذذ اور تفریح میں موجودہ تہذیب کے اثرات کی رو سے فرق نہیں کیا جاتا۔ دیکھا جائے تو تفریح ایک اعنانی تصور ہے۔ ایک سرگرمی ایک معاشرہ میں باعث تفریح ہے اور دوسری سوسائٹی میں اسے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ ایک بگڑے ہوئے معاشرے کا فرد جس چیز میں لطف محسوس کرتا ہے، ایک مسلم الفطرت شخص اس سے بیکارے گا۔^{۲۳} جنسی میلان ایک حقیقت ہے، جس سے نہ آنکھیں بند کی جاسکتی ہیں نہ اسے غلط راہ پر لے جانے کے مواقع فراہم کئے جاسکتے ہیں، تعلیمی اداروں میں گزرنے والا وقفہ عمر اس لحاظ سے اہم اور فیصلہ کن ہے اور ہم نصابی سرگرمیاں اس میں ایک مؤثر کردار ادا کرتی ہیں۔

ہم نصابی سرگرمیوں کا ایک پہلو کھیل، ایسے کھیلوں کے انتخاب، ان کی ترتیب ان کے لئے لباس، ان کی تربیت کے انتظامات ان سب میں ثقافتی و معاشرتی اقدار کا دخل ہوتا ہے اور یہ تہذیب ہی اپنی اقدار کے مطابق اس کی روایات ہوتی ہیں۔ اسلامی اقدار کی رو سے کھیل منع نہیں ہیں لیکن وہ کھیل

جن سے وہ فائدہ تو کوئی حاصل نہ ہو جو کھیل کے فائدے تصور کئے جاسکتے ہیں لیکن وہ سب اثرات ضرور ہوں جو مغربی تہذیب کی نظریں مطلوب ہوں، اسلامی معاشرہ میں انہیں خود ہی رواج نہیں پانا چاہیے۔ انہی سرگرمیوں کی ذیل میں اجتماعی تقریبات اور مختلف مقابلے ہیں جن کے ذریعے طالب علم کے ذوق و فن کی اور صلاحیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ تفریحی و تحریری مقابلے، تعلیمی ادارے کے مجلے، سالانہ تقریبات، وراثتی پروگرام وغیرہ ہیں۔ اس دائرہ میں بھی دو مختلف تہذیبیں اپنا اپنا عکس پیش کریں گی۔

کوشش کی گئی ہے کہ سرسری طور پر ایک جائزہ سے یہ حقیقت سامنے لائی جائے کہ ہم لفظی سرگرمیاں اپنے مختلف دائروں میں تہذیبی و ثقافتی اقدار کی نمائندگی کرتے ہوئے نئی نسل کے کردار اور اس کی علمی زندگی پر لازماً اپنا تاثر قائم کرتی ہیں۔ اسلامی اقدار درسی کتب اور استاد کی شخصیت سے بھی ظاہر ہوتی ہیں لیکن تاثر کے لحاظ سے ان سرگرمیوں کی خصوصی اہمیت نکاتاً کرتی ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کے تصوراتی خاکہ کے بیان میں اور انہیں ان کا واقعی مقام دیا جائے۔ ان سرگرمیوں سے ایک ماحول تشکیل پاتا ہے۔ اس ماحول کے دو عناصر ہیں۔

۱۔ درودیوار کا ماحول

۲۔ جیتا جاگتا ماحول

درودیوار کا ماحول

یہ ماحول بھی طالب علم کی ذہنیت کو رہ اور شخصیت کو متاثر کرتا ہے۔ اس کتاب کی مناسب شکل کیلئے،

الف - ہماری تعمیرات میں اسلامی فن تعمیر کی جھلک ہونا چاہیے۔

ب - نماز کی ادائیگی کے لئے مساجد یا نماز کے لئے مخصوص کمرے ساتھ ہونا چاہئیں۔

ج - طہارت کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے فراغت کے لئے مناسب انتظامات ہونا چاہئیں۔

د - عمارت کے ساتھ گیلے، پورے اور باغ ہونا چاہئیں تاکہ طالب علم قدرت کی کارفرمائی کا مطالعہ کریں۔ انہیں اس طرف متوجہ بھی کیا جائے۔

۵ - کلاس روم کی دیواریں اور عمارت کے رستے ایسے کبتوں اور مناظر سے آراستہ ہونا چاہئیں جو دہاں چلنے پھرنے والے کو حقائق حیات کی طرف متوجہ کریں۔

اس طرح درود دیوار کا یہ ماحول اس ماحول کا مواد بنے گا جو ہم نصابی سرگرمیوں سے تشکیل دینا پیش نظر ہے۔

جیتا جاگتا ماحول

ہم نصابی سرگرمیاں یہ ماحول بناتی ہیں۔ ان سرگرمیوں میں طالب علموں کو کلاس روم سے باہر کی فضا میں ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے۔ نہ صرف ایک شہر کے مختلف تعلیمی اداروں کے طلبہ کو ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے بلکہ مختلف شہروں بلکہ مختلف مسلم اور غیر مسلم ممالک کے طلبہ کو میل جول کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ طلبہ کو ملک کی اور شہر کی بڑی شخصیات کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے دوران ان کا رابطہ اپنے اساتذہ سے نسبتاً آزاد دنیا میں ہوتا ہے — میل جول کے یہ مواقع کردار کی تربیت میں اہم حصہ ادا کرتے ہیں۔

ان سرگرمیوں کی تاثیر کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاشرے کے ذرائع ابلاغ تعلیمی اداروں کی دراصل انہی سرگرمیوں کی رپورٹنگ کرتے ہیں۔ بالواسطہ طور پر اخبارات اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی یہ رپورٹنگ ایک تقریب یا واقعہ کے اثرات پورے ملک میں اور اس طرح طلبہ میں پھیلا دیتی ہے۔

طلبہ یونین

ہم نصابی سرگرمیوں میں طلبہ میں خود شرکت کا احساس پیدا کرنے کا ایک آزمودہ طریقہ یہ ہے کہ کام انہی سے کرائے جائیں اور خود ان کو ذمہ داریاں دی جائیں۔ شرکت اور ذمہ داری سے ان کی صلاحیتوں کو نشوونما ملتی ہے اور اساتذہ بھی ان کے کردار کی تشکیل میں بہتر حصہ لے سکتے ہیں۔ منتخب یا غیر منتخب، ابتدائی اور اعلیٰ سطح کے تمام اداروں میں اس قسم کی انجینئرس ہم نصابی سرگرمیوں کو با مقصد اور با معنی بناتی ہیں۔

ان سرگرمیوں کی نوعیت کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر سے کچھ امور بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اصولاً تو مرتبہ ثابت بات ہی پیش کی جائے تو کافی ہے، لیکن چونکہ ایک مختلف عملی صورت حال ایک پس منظر کے طور پر موجود ہے اس لئے وضاحت کی خاطر کچھ منفی امور کا ذکر بھی آنے گا۔

اول

۱۔ اسلامی نظام تعلیم میں مخلوط تعلیم نہیں ہوتی اس لئے مخلوط سرگرمیوں کا پورا دائرہ ہی نہیں ہوتا — طلبہ اور طالبات کے تعلیمی ادارے اپنی اپنی المدارس میں الگ الگ یا بین الجامعاتی تقریبات کرتے ہیں۔

۲۔ طالبات کی سرگرمیوں کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے اور طلبہ کی سرگرمیوں کا اپنا۔ طالبات لازماً وہ سب کھیل نہیں کھیلتیں جو طلبہ کھیلتے ہیں۔ طلبہ کے اپنے کھیل ہوتے ہیں جو ضروری نہیں کہ طالبات کھیلیں۔ اسی طرح طالبات کے اپنے کھیل ہوتے۔ جو ضروری نہیں کہ طلبہ کھیلیں۔ طلبہ اور طالبات کے باہمی مقابلے نہیں ہوتے تھے۔ طالبات کے جن کھیلوں کے لئے میدان کی ضرورت ہوتی ہے اس کے گرد مناسب چار دیواری لازم ہے۔ ان کے مباحثوں کے موضوع مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان کی تفریح کے انداز مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان کے شوق اور مشاغل مختلف ہو سکتے ہیں۔ اسی کا ضمنی پہلو یہ ہے کہ ان کی تقریبات کی تصاویر اخبارات و رسائل کی زینت نہ بنیں۔

دوم

۱۔ تمام ہم نصابی سرگرمیوں کی خواہ وہ طلبہ کی ہوں یا طالبات کی، پہلی بنیادی اور مشترک تدریس ہے کہ اسلامی ثقافتی اقدار کا لحاظ رکھا جائے۔ یہ ایک مثبت نکتہ ہے۔ یعنی یہ سرگرمیاں ان اقدار کو پروان چڑھانے والی ہوں۔ اگر اس سے یہ تاثر ہو کہ اس طرح دراصل ان تقریبات کے لطف و تفریح کے اصل پہلو کو ختم کر دیا گیا ہے تو

یہ دراصل اس دور کے پس منظر کا اثر ہے جس میں مسلمان اس وقت ہیں۔ یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ تفریق کا تقوراضا فی تصور ہے۔ اسلامی نظام قائم ہر ترقی نسل ان سرگرمیوں میں تفریح محسوس نہ کرے گی جن سے اسلامی اقدار مٹتی ہوں۔ یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اسلامی اقدار کا مطلب فطری سرگرمیوں پر پابندی نہیں بلکہ بے راہ روی پر جو بالآخر خود انسان کو اس دنیا اور آخرت میں ہلاکت میں ڈالتے والی ہے پابندی مراد ہے۔ انسان کے فطری دائرہ میں خالق انسان کی بتائی ہوئی حدود کے اندر آزادی ہی آزادی ہے۔ انسان کی فلاح اس میں ہے کہ وہ ان حدود سے باہر نہ جائے۔

۲۔ ان سرگرمیوں کی دوسری اہم قدر، قومی امور اور مفاد کی عکاسی ہوگی جس ملک میں یہ سرگرمیاں ہوں، لازماً وہاں کی تاریخی روایات، شخصیات، لوگوں کی عادات، اطوار، شوق و ترجیحات کی جھلک ان میں ہونا چاہیے۔ بلائبہ، اسلامی نقطہ نظر سے ان کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے لیکن انتخاب میں نظریہ کی بنیاد پر تشکیل پایا ہوا اختیار تیزی استعمال کرنا ہوگا۔ مثلاً اگر کسی قوم کی ماضی کی تاریخ میں بت پرستی ہوئی تھی تو اس بنیاد پر بت بنانے کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔

ان امور کا لحاظ کرنے سے ان سرگرمیوں کا بنیادی آہنگ نصاب اور درسی کتب کے آہنگ سے مربوط ہو جائے گا۔ اور یہ مربوط ہم آہنگی کردار کی تشکیل میں موثر اور مثبت حصہ ادا کرے گی۔

ان عمومی نکات کے بعد کچھ نسبتاً زیادہ متعینہ نکات پیش کئے جائیں گے۔

سوم

۲۔ تعلیمی اداروں میں اسلامی عبادات دارکان کی ترویج میں ان سرگرمیوں سے مدد لی جائے۔ دورانِ تعلیم، نماز کا وقت آنے پر سربراہ، تدریسی وغیرہ تدریسی عملہ اور طلبہ سب نماز ادا کریں۔ رمضان میں مناسب لحاظ رکھا جائے۔ حج کے موقع

پر فلم دکھائی جاسکتی ہے، تقاریر کروائی جاسکتی ہیں۔ حج کئے ہوئے استاد یا طالب علم سے تاثرات سُننے جاسکتے ہیں۔

۲۔ اسلامی تاریخ اور شخصیات اور اسی طرح قومی تاریخ اور شخصیات کے لحاظ سے مختلف پروگرام رکھے جائیں۔ انکے واقعات اور ان کی زندگی پر تقاریر مسلمانین یا فن کے دوسرے ذرائع کے طلبہ کی صلاحیتوں کو اظہار اور نشوونما کے مواقع ملیں۔

۳۔ معاشرے کی کسی اہم یا کسی بھی لحاظ سے طلبہ کے لئے نمونہ کی حیثیت رکھنے والی شخصیات کو تعلیمی اداروں میں دعوت دی جائے۔

۴۔ سفر کا حکم قرآن میں ہے اور یہ حصول علم کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ بے شمار طریقوں سے زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے قومی فوائد بھی ہیں اور تربیتی فوائد بھی۔ ایک ایسی پالیسی کے طور پر اس کا اہتمام کیا جائے کہ اپنا ملک دیکھنے کے لئے طلبہ ایک حصے سے دوسرے حصے کو جلائیں اور اسلامی ممالک آپس میں طلبہ کے تبادلے کریں اور دیگر ممالک میں بھی طلبہ جلائیں۔

۵۔ تفریح کے لئے پکنک ہے، جہاں طلبہ اور چھوٹے بچے بھی جلائیں۔ ان پکنکوں کو بھی تفریح کے ساتھ ساتھ تربیت کا ذریعہ بھی اسی طرح بنایا جاسکتا ہے کہ دوران تفریح اقدار کا لحاظ رکھا جائے۔

۶۔ شعر، اظہار و بلاغ کا موثر ذریعہ ہے۔ اسے مثبت اور موثر طور پر استعمال کیا جائے۔ متنوع ہم نسلی سرگرمیاں اس کی بنیاد پر کی جاسکتی ہیں۔

۷۔ قلم لفظ لکھنے کے لئے بھی ہے اور دیگر دائروں میں بھی ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ طلبہ میں اس کے حوالے سے صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے لئے متنوع طریقے اختیار کئے جائیں۔

ہم نسلی سرگرمیاں سستی نعرہ بازی، بھونڈے پن اور جذباتیت کا مظہر نہ ہوں۔ نسب الیمین کی پاکیزگی، خیال کی گہرائی اور ندرت، حقائق پسندی اور اظہار کی تاثیر کا نمونہ ہوں۔ یہ سرگرمیاں اسلامی اقدار کی ترجمان ہوں۔ ان کے ذریعے ایسا ثقافتی عمل جاری ہو جو نئی نسل میں ذہنی انتشار و آوارگی پھیلانے

قیس کی طرف مائل کرنے اور جنسی ہیجان پھیلانے والا نہ ہو بلکہ منبط نفس، ایشار اور جو شس کردار پیدا کرنے والا ہو۔

۸۔ حکومت اور تعلیمی انتظامیہ

نظام تعلیم کے تشکیل دینا صرف میں حکومت اور اس کی تعلیمی انتظامیہ کو ایک مقام حاصل ہے۔ حکومت کسی ریاست کا منظم ترین اور طاقت ور ترین ادارہ ہے جسے معاشرہ کی زندگی کے تمام گوشوں کو متاثر کرنے کے سب سے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، نظریاتی مملکت میں یہ اختیارات ان تمام گوشوں کی نظریہ کے مطابق صورت گیری کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ تعلیم ایک اہم دائرہ ہے اور نظریہ کے نقطہ نظر سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے اس لئے نظریاتی مملکت اس پر غیر معمولی توجہ دیتی ہے۔ اسلامی ریاست میں حکومت عوام کی مرضی سے برقرار رہتی ہے۔ تعلیم کے بارے میں عوام کی امنگیں اور آرزوئیں حکومت کی پالیسی کے ذریعے ہی تکمیل پاسکتی ہیں۔ اسلامی نظام میں عوام کی آرزوئیں اور حکومت کی پالیسیوں میں ہم آہنگی ہوتی ہے اور یہ نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل، معاشرے سے اس کے ربط اور مثبت اور مطلوبہ نتائج کے حصول میں مددگار بن جاتا ہے۔

یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ آن کے دور میں کسی ملک کا نظام تعلیم حکومت کے بغیر بھی بن سکے نہ صرف اس لئے کہ عمل تعلیم بچیدہ اور گراں ہو گیا ہے اور حکومت کے وسائل کے بغیر کسی آبادی کی تعلیم کا کل انتظام عملاً ناممکن ہے بلکہ اس لئے بھی کوئی حکومت قومی منصوبہ بندی اس کے بغیر نہیں کر سکتی کہ نظام تعلیم میں اس کا عمل دخل ہو۔ اس لئے شرکت ناگزیر ہے مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں اسلام کے اجتماعی مزاج اور مقاصد تعلیم کے حصول کے نقطہ نظر سے اس کے لئے بہترین عملی صورت کیا ہو سکتی ہے۔

اسلامی حکومت کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اسلامی معاشرہ میں تعلیم محض سرکاری کارروائی نہیں بلکہ ایک معاشرتی عمل ہے۔ حکومت کی اس میں شرکت معاشرے کے نمائندہ کی حیثیت سے ہے۔ حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ کھلے ذہن سے قومی سطح کے ایسے افراد کو راہنمائی اور مشورہ کے عمل میں شریک کرے جو حقیقی معنوں میں ماہر تعلیم ہوں۔

حقیقی معنوں میں ماہر تعلیم وہ ہے جو اسلام اور اس کے مقصود و مہنہ پر گہری نظر رکھتا ہو۔ اسلامی

تاریخ کے نشیب و فراز سے واقف ہو، عالم اسلامی کی جدید تحریکات اور اس کے رجحانات سے باخبر ہو، جدید علوم بالخصوص فلسفہ، نفسیات اور تعلیم میں جدید ترقیات کو بخوبی جاننا ہو، معاشیات اور دیگر معاشرتی علوم سے بہرہ ور ہو، غور و فکر کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کا مالک ہو، اپنے عہد کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر تعلیم کی تکنیک کے ذریعے ملی و قومی درجہ کو نئی پود تک بطریق احسن پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کا علم محدود اور نظر کوتاہ نہیں ہوتی۔ علم، تعلیم اور تعلیم سے اس کا ناٹھ اور شعف زندگی بھر کا ہوتا ہے۔ اس کا فکر وسیع تجربے اور پختہ مشاہدے کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔

ایسے ماہر تعلیم، حکومت کے ملازم نہیں ہوتے۔ حکومت کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ نظام تعلیم کی تشکیل اور اس کے لئے پالیسی بنانے میں ایسے ماہرین کا تعاون حاصل کرے اور ان کے مشورے اور رہنمائی میں کام کرے تعلیم کے پیشہ ور ماہروں کو ان شخصیات پر بالادستی حاصل نہ ہونا چاہیئے بلکہ انہیں ان کی رہنمائی میں چلنا چاہیئے۔

قومی سطح کے ان ماہرین کے ساتھ حکومت کو مختلف سطح کے غیر معمولی باصلاحیت اساتذہ کو بھی اسی عمل میں شریک کرنا چاہیئے۔ یہ اساتذہ ہیں جو تعلیم کے میدان میں موجود عملی مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں اور اپنے مشاہدے اور تجربے سے فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اس طرح ایک اعلیٰ ادارہ تعلیم کے نگران کی حیثیت سے تشکیل پائے گا جس میں ماہرین تعلیم اساتذہ اور پیشہ ور ماہرین تعلیم شامل ہوں گے۔ ان کے باہمی مشورہ سے تعلیم کی اسلامی تشکیل کے لئے مناسب خطوط سامنے آئیں گے جو قابل عمل بھی ہوں گے اور مقاصد تعلیم کے مطابق بھی۔ اس اعلیٰ ادارہ کی مدد سے کسی ملک کی حکومت اسلامی نظام تعلیم میں جو حصہ ادا کر سکتی ہے اسے اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے :

۱۔ تعلیمی حکمت عملی

مقاصد تعلیم، ملک کی ضروریات اور مخصوص حالات کو سامنے رکھ کر تعلیمی پالیسی تیار کی جائے۔ ہر دائرہ کے لئے واضح راہنما خطوط طے کئے جائیں۔

۲۔ تعلیمی منصوبہ بندی

تعلیمی پالیسی کی روشنی میں منصوبہ بندی حکومت کا اولین فریضہ ہونا چاہیئے۔ اس کی

بنیاد پر تعلیم کے مختلف معائنہ میں ہدف طے ہوں اور ان کے حصول کے لئے حکمت عملی وضع کی جائے۔ یہ منصوبہ بندی آزاد اسلامی ذہن سے ملک کی متنوع حقیقی ضروریات کو سامنے رکھ کر کی جائے۔ آج کی مسلم ملکوں کی طرح ہمیں جو غیر ملکی ماہرین پر انحصار کر کے ایسے رستے پر چل پڑتی ہیں جو ملی و قومی مقاصد کے خلاف ہوتا ہے منصوبہ بندی میں اسلامی دینی نقطہ نظر سے ترجیحات قائم کی جائیں۔

۳۔ وسائل کی فراہمی

تعلیم کی اسلامی معاشرہ میں اہمیت کے مطابق اس کے لئے وسائل فراہم کئے جائیں۔ حکومت خود اس میں پیچھے نہ رہے اور معاشرہ کو بھی مختلف طریقوں سے اس میں شریک کرے۔ اسلامی مملکت کے لئے کسی غیر ملکی ادارہ کے دیتے ہوئے معیار کی کوئی حیثیت نہیں اس لئے کہ وہ اسلامی نظریاتی مملکت میں تعلیم کی اہمیت اور اس کے کردار کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اسلامی مملکت کو تعلیم کے لئے (Maximum) بجٹ فراہم کرنا چاہیے۔ اور ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہیں کہ معاشرہ اس کے لئے اپنے وسائل خود وقف کرے۔

۴۔ جائزہ و احتساب

حکومت کو مذکورہ اعلیٰ ادارہ کے توسط سے ایسے ادارے بنانا ہوں گے جو ملک کے ہر حصے میں تعلیمی پالیسی پر عملدرآمد، منصوبہ بندی کی مکمل تنفیذ اور بجٹ کے صحیح استعمال کا جائزہ لیں گے۔ حکومت کی اپنی انتظامیہ، اساتذہ اور تعلیم سے متعلق تمام ادارے اور سرگرمیاں ان کے دائرہ میں ہوں گی۔ یہ نظریہ مملکت کے واضح شعور کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیں۔ احتساب بھی کریں اور وارسی بھی۔ تعلیمی دائرہ میں ظلم و بے انصافی کو کسی قیمت پر روا نہ رکھا جائے۔

ایک نیا تصور

سطور بالا میں جس اعلیٰ ادارہ کا تصور پیش کیا گیا ہے، اسے بنیادی طور پر راہنمائی اور مشورہ کا منصب دیا گیا ہے اور عملاً بالادستی حکومت وقت کی ہی تجویز کی گئی ہے۔ بتایا اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کے دور کے حالات کے پس منظر میں ہمارے لئے یہ سوچنا مشکل ہے کہ نظریاتی، قومی، معاشی اور ہر لحاظ سے اتنی اہم اجتماعی سرگرمی حکومت کے باضابطہ کنٹرول سے باہر ہو حالانکہ اگر تعلیمی انتظامیہ فاصلتاً سرکاری اور پیشہ ورانہ ہر توجیہ امکان ہے کہ یہ اپنے حصار میں قید ہو جائے اور معاشرہ سے اس کا ربط ٹوٹ جائے۔ عجب کہ تعلیم میں شرکت معاشرہ کا فرض ہے اور اس سے خوش گوار نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس بارے میں ایک اور طرز فکر بھی قابل غور ہے اور اس کی اساس اسلامی معاشرہ کے حقیقی مزاج اور مسلم تاریخ میں اس کی جس تعلیمی روایت کا اظہار ہوا ہے اس پر ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں تعلیم معاشرہ کی ایک ایسی آزادانہ سرگرمی رہی ہے جو کمال اہل علم کے ہاتھوں میں رہی ہے معاشرہ نے اپنے وسائل سے خصوصاً اوقاف کے منظم ادارہ کے ذریعے ایسے ہمگیر تعلیمی نظام قائم رکھے ہیں جس کی مثال دوسری تہذیبوں میں نہیں ملتی۔ وسائل کی فراوانی کا یہ عالم رہا ہے کہ غالب علم کی نہ صرف تعلیمی بلکہ تمام ضروریات کا کفیل یہ نظام ہوتا تھا۔

جب کسی جدید معاشرہ میں اسلامی نظام تعلیم نافذ کیا جائے تو یہ سوال لا محالہ ابھرتا ہے کہ کیا آج کے دور میں ان تعلیمی تصورات اور روایت کے مطابق تعلیم کے نظم و نسق کے لئے کوئی عملی شکل تجویز کی جاسکتی ہے؟

نئی نسل قوم کی امانت ہے جو تعلیم و تربیت کی خاطر قوم ایک نظام کے سپرد کرتی ہے۔ یہ نظام ایک معاشرتی عمل کی ادائیگی کے لئے قائم کیا گیا ہے اور معاشرہ کا خور و خور یہ فرض ہے کہ وہ اس عمل کی نگرانی کرے کہ یہ نظام اس کی امنگوں اور آرزوؤں کے مطابق کام کرے۔ اسے سیاسی آثار چڑھاؤ اور حکومت کے ادل بدل سے متاثر نہ ہونا چاہیئے۔ اسے غیر سیاسی ہونا چاہیئے۔

جس نوعیت کے ادارہ کا ذکر اس باب کے آغاز میں کیا گیا وہ حکومت کا ماتحت یا صرف مشورہ کے لئے نہ ہو بلکہ ایک آزاد اور خود مختار ادارہ ہو جو پارلیمنٹ اپنے قانون کے ذریعے قائم کرے۔ اس

میں درج ذیل زمروں سے نمائندگان شامل ہوں۔

- قومی سطح کے ماہرین تعلیم
- انتظامیہ کے نمائندے
- اساتذہ کے نمائندے
- سیاسی اداروں کے نمائندے

حکومت وقت اس ادارہ سے رابطہ کے لئے ایک مختصر دفتر قائم رکھے۔ اس کے علاوہ اس کی جانب سے کوئی مداخلت نہ ہو۔

اس ادارہ کی آزادی کی ضمانت اسی طرح دی جائے کہ کل تعلیمی بجٹ کے وسائل اس کے اختیار میں ہوں۔ حکومت کی جانب سے اسے وسائل فراہم کئے جائیں، لیکن یہی اس کے کل وسائل نہ ہوں۔ بلکہ دیگر ممکنہ ذرائع سے بھی رقوم جمع ہو کر براہ راست اس کے تصرف میں آئیں۔ معاشرہ مختلف اوقات قائم کرے اور اس کی مستقل آمدنی اس کو ملے۔ یہ خود آمدنی میں اضافہ کے اور معاشرہ کی جانب سے شرکت کی حوصلہ افزائی کے لئے تذبذب اختیار کرے۔ خود بخاری کی اصل ضمانت اس طرح حاصل ہو کہ وزارت خزانہ اس کے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔

ملک میں تعلیم سے متعلق تمام مرکزی شعبے اس ادارہ کے ماتحت ہوں۔ یہ عملاً حکومت کا قائم مقام ہو گا لیکن اپنی ساخت اور معاملات میں حکومت سے آزاد ہو۔ اس مرکزی ادارہ کے تحت زیریں سطح پر اسی نوعیت کے ادارے ہوں یعنی مثلاً صوبے اور ضلع کی سطح پر پھر آخری سلسلے پر تعلیمی ادارہ کے ساتھ ایک مجلس منتظمہ ہو جس میں ادارہ کے قریب رہائش پذیر چند اہل الرائے افراد شامل ہوں گے اور وہ ادارہ کے صحیح رخ پر اپنے اور تعلیم کے مقاصد پر رے کرنے کو یقینی بنائیں۔

اس تصور کو عملی جامہ پہنانے میں بہت سی مشکلات پیش آئیں گی اور بہت سے مسائل اٹھیں گے لیکن اگر اہل الرائے یہ سمجھیں کہ یہ اسلام کے تصور سے زیادہ قریب ہے تو اس کی تفصیلات طے کرنے، مشکلات دور کرنے اور مسائل حل کرنے کے لئے غور و فکر کیا جاسکتا ہے۔

تعلیمی انتظامیہ

اب کچھ نکات اس انتظامیہ اور اس کے عملہ کے بارے میں پیش کئے جا رہے ہیں جو اس مجوزہ

ادارہ کے تحت کام کرے یا موجودہ صورت حال کے مطابق کسی حکومت کی ماتحت ہو،

تعلیم معاشرہ کا ایک منظم ادارہ ہے اور اس کے سلسلے اتنے پیچیدہ ہوئے ہیں کہ ان کا انتظام و انصرام بذاتِ خود ایک اہم کام ہے۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو نصاب و استاد کے ساتھ ساتھ تعلیمی انتظامیہ کا کردار واضح طور پر نظر آئے گا جو وہ مقاصدِ تعلیم کے حصول میں ادا کرتی ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم میں مرکزی نقطہ یہ ہے کہ جن مقاصد کا تعین کیا گیا ہے اور اس کے پیشِ نظر جو حکمتِ عملی وضع کی گئی ہے اس پر عمل اور جو ہدف مقرر کئے گئے ہیں ان کا حصول یقینی بنایا جانے۔ کوئی نظریاتی ممکنات اس بارے میں سہل انگاری کی روش اختیار نہیں کر سکتی کہ نصب العین و مقاصد کے حصول کی توقع طلبہ اور اساتذہ سے کرے اس کے لئے پالیسی بھی بنائے لیکن اس کے لئے ضروری اور مناسب انتظامیہ تشکیل نہ دے۔

انتظامیہ کا تفصیلی ڈھانچہ کسی بھی اسلامی ملک میں اس کی ضروریات اور اسلامی تقاضوں کے مطابق تشکیل پائے گا لیکن اسلام کی راہنمائی میں اس کے لئے بعض بنیادی امور مرتب کئے جاسکتے ہیں ہم انہی کی طرف اشارہ کریں گے۔

اسلامی ملک کی تعلیمی انتظامیہ میں یہ خصوصیات ہونا چاہئیں۔

۱۔ انتظامیہ میں گہرا نظریاتی شعور ہونا چاہیے۔ ایسا شعور جو صرف ذہن و فکر تک نہ رہ جائے بلکہ عملی زندگی میں بھی ظاہر ہو (مثال کے طور پر انہیں نماز کا پابند ہونا چاہیے اور اسلامی اقدار ان کی زندگی میں جھلکنی چاہئیں)۔ اس کے بغیر نظریاتی پالیسی کی تنفیذ ممکن نہیں۔ انتظامیہ کی کسی بھی سطح کا تعلق محض فائلوں سے نہیں بلکہ اساتذہ، طلبہ اور خود اپنے ماتحت اور بالا ارکان سے ہوتا ہے۔ اور اس ربط میں اگر وہ خود نظریہ سے بے بہرہ ہونا ظاہر کریں تو کس طرح تعاون کی توقع کر سکتے ہیں۔ دوسرے بہ کرا حکامات اور فیصلوں کی حقیقی روح کو سمجھنے اور عمل درآمد

* ”تعلیمی انتظام“ اور ”حکومت اور اس کی تعلیمی پالیسی“ کو دو عناصر کی حیثیت سے یا گیا ہے حکومت سے مراد وہ اعلیٰ ادارے ہوں گے جن کا تعلق تعلیمی پالیسی سے ہو اور انتظامیہ کا متنبہ دائرہ تنقید ہے۔

کا جائزہ لینے کے لئے بھی یہ شعور ناگزیر ہے۔

۲۔ انتظامیہ کے ارکان کو پیشہ ورانہ مہارت سے بھی متصف ہونا چاہیے محض نظریاتی شعور بھی مقاصد کو شکست دینے کا سبب بن سکتا ہے اگر مہارت حاصل نہ ہو یہ ہماری اس دور کی قسمتی ہے کہ مسلمان ممالک میں ماہرین تعلیم وہ ہیں جنہوں نے غیر اسلامی تمدن و تہذیب کے تربیتی اداروں میں تعلیم و تربیت اور سند حاصل کی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں ضروری ہوگا کہ تعلیمی انتظامیہ کو بطور پیشہ اختیار کرنے والوں کے لئے تعلیم و تربیت کے ادارے خود ان ممالک میں ہوں اور ان کی تعلیم و تربیت اور نصاب میں ملی و قومی انداز کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ اور نظریاتی شعور کے ساتھ ترقی یافتہ ممالک کی تحقیقات، نظام اور اداروں سے استفادہ بھی کیا جاتا ہو۔

۳۔ نظریاتی شعور اور پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ تیسری صفت اس جذبہ کا ہونا ہے جسے ہم مشتری اسپرٹ کہہ سکتے ہیں۔ یعنی مقصد حاصل کرنے کے لئے جذبہ کوشش اور قربانی سے بھی دریغ نہ کرنا۔ کام کو ضابطہ کی کارروائی کے بجائے اپنا ایسا فرض سمجھنا کہ جس سے اپنی ذات کی خیر و نفع وابستہ ہے۔ اس جذبہ کو پڑان چڑھانے میں اسلامی معاشرہ کی عمومی تربیت بھی اپنا حصہ ادا کرے گی اور پیشہ کے لئے خصوصی تربیت بھی جس کے نتیجہ میں ایک انتظامیہ کو احساس ہو کہ وہ کتنا اہم ملی و قومی فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

۴۔ تعلیمی انتظامیہ میں انتخاب، تقرر اور ترقی کے ایسے ضابطے ہونا چاہیں جو صحیح معیار کو جس کے کچھ اجزاء کا ذکر پہلے تین نکات میں کیا گیا، پر دان چڑھانے والے اور اہل افراد کی ہمت افزائی کرنے والے ہوں۔ جب تک صحیح معیار کا تعین نہ ہو اور سچی قابلیت اور صلاحیت کے انسان کو تلاش نہ کی جائے وہ سامنے کیسے آئے اور اپنا رول کیونکر ادا کرے بعد میں کارکردگی کے مظاہرہ کے دوران میں برابر جائزہ کا ایسا میکنزم بنایا جانا چاہیے جس کے ذریعے دیکھا جاسکے کہ اسے مملکت کے مقاصد سے کتنی آگاہی اور لگاؤ ہے اور ان مقاصد کے لئے کس قسم کے ایثار پر آمادہ ہے۔ اس کا رویہ غرور، نفرت اور انسان بنیاری کا تو نہیں۔ اس نے اپنے کو موقع پرست کاروباری فرد تو ثابت نہیں کیا۔ ترقی کی بنیاد یہی جائزے ہونا چاہیں۔ نظریہ سے وابستگی، وطن سے محبت،

ناجائز آمدنی سے پرہیز، شائستہ طرز عمل، نرم برتاؤ اور اپنے کام کی بروقت صحیح انجام دہی ان اقدار کا حقیقی مقام نظام میں ہو اور یہ صورت حال نہ ہو کہ ایک بددیانت افسر نہ صرف یہ کہ موجود ہو بلکہ ترقی بھی دہی کرتا چلا جائے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہو کہ اہل تربیت یافتہ افراد کو اعلیٰ مناصب پر براہ راست انتظامیہ میں لیا جائے محض سینارٹی ہی بنیاد نہ ہو۔ نظریاتی مملکت کے لئے یہ ایک موثر تجربہ ہے جس کے استعمال میں احتیاط کرنا ہوگی کہ یہ اقربا پروری کا ذریعہ نہ بنے بلکہ تعلیمی قیادت میں اہلیت و صلاحیت کی بنا پر استفادہ کا ذریعہ بنے۔

۵۔ تعلیمی انتظامیہ کی ایک خصوصیت اسراف و تبذیر سے بچت اور سادگی کو اختیار کرنا بھی ہے۔ وسائل کے استعمال کی جواب دہی کا احساس ان اقدار پر عمل کے لئے محرک ہے۔ علمہ غیر ضروری طور پر زیادہ نہ ہو جو ہودہ نشان و شوکت اور کرد و فریا خراجات نہ کرے۔ غیر ضروری ادارے اور ڈھانچے نہ ہوں، ہر ادارہ کے کام متعین ہوں ایک ہی کام کئی کئی جگہ نہ ہو کسی ایسے تناسب کی پابندی کی جائے جو انتظامی اخراجات اور اصل تعلیم کے اخراجات کے درمیان مناسب سمجھا جائے۔ جب انتظامیہ مالی وسائل کو احتیاط اور ذمہ داری سے خرچ کرتی نظر آئے گی تو اس کے اثرات تعلیم کے دوسرے شعبوں پر بھی پڑیں گے اور انتظامیہ اس سلسلہ میں باز پرس کا حق بھی رکھے گی۔

۶۔ اسلامی نظام تعلیم کی انتظامیہ کی کامیابی کا ایک معیار یہی ہے کہ یہاں کام مناسب رفتار سے ہوں، نہ تاخیر ہو، نہ تاخیری حربے ہوں، دوسرے الفاظ میں سرخ فیتہ نہ ہو یا ہو تو بہت چھوٹا ہو۔ اس کا ایک پہلو حکومت کی پالیسی اور احکامات کا ابلاغ اور نفاذ ہے جس میں تاخیر مقاصد کو شکست دینے کا باعث ہوتی ہے اور دوسرا پہلو دوسرے متفرق ذمہ داریاں اور کام ہیں جن میں سے ایک اساتذہ کے معاملات بھی ہیں جو انتظامیہ کو نبٹانے ہوتے ہیں۔ اگر یہ توقع کہ انتظامیہ کے تقرر و انتخاب میں ان امور کا واقفائی نظر رکھا جائے گا جن کا ذکر اوپر کیا گیا، پوری ہو تو یہ مسئلہ اپنے آپ کم ہو جائے گا۔ لیکن اس کی بھی ضرورت ہے کہ پورے نظام کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ مختلف اداروں کے مقاصد، ان پر کام کا بوجھ اور اس کے لئے مناسب عملہ کا تعین کیا جائے۔ عملہ میں خواہ مخواہ کے اضافہ کے بجائے عملہ کو مستعد رکھنے کی تدبیر اختیار کی جائے اس میں دوسرے ملکوں کی مثالیں بھی سامنے رکھی جاسکتی ہیں جہاں بہت کم تعداد کا عملہ، بڑے بڑے نظاموں کو کامیابی سے چلا رہا ہو اس کا یہ پہلو

بھی سامنے رہے کہ اگر اساتذہ اپنے انتظامی معاملات میں الجھا دیئے جائیں اور ان کے معمول کے کام ذاتی طور پر چکر لگائے بغیر انجام نہ پائیں تو اس کا براہ راست اثر ان کی کارکردگی پر اور تعلیم کے عمل پر پڑتا ہے جسے بہر حال اذنین ترجیح حاصل ہونا چاہیئے۔

۷۔ انتظامیہ کے افراد اسلامی کردار رکھتے ہوں تو نظری طور پر بدنیاتی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ افراد بہر حال انسان ہیں اور انسان اس دنیا میں آزمائش کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ مواقع آزمائش کے لئے ہی آتے ہیں۔ نظام کی خوبی یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے افراد کو ان مواقع پر غلط راہ پر چلنے سے باز رکھے۔ بعض ممالک میں، اور ان میں مسلمان ممالک بھی شامل ہیں، اساتذہ کے تقرر و انتخاب میں تعلیمی اشیاء کی خرید و فروخت میں اور بجٹ کے دوسرے استعمالات میں جس جس نوعیت کی اور جس درجہ کی بددیانتی ہے اس کی مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ نظام میں ایسی تدبیر اختیار کی جائیں کہ اس کے امکانات کم سے کم ہوں اور پھر بھی کوئی ملوث ہو تو علم میں آنے کے بعد اس پر کارروائی ہو اور وہ بھی سب کے علم میں آئے۔

۸۔ انتظامیہ کی مختلف سطحوں کے عمل کے لئے تفصیلی امور اس مطالعہ کے دائرہ میں نہیں — تاہم تعلیمی ادارے کے سربراہ کے لئے جو انتظامیہ کی پہلی سطح ہے لیکن مؤثر ہے اور تدریسی عمل کے براہ راست نگران ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ لازمی ہے کہ وہ ان خصال کا مالک ہو جو نظریاتی ملک میں اچھے استاد اور اچھے منتظم کے لئے ضروری ہیں۔ سربراہ کے استاد یا غیر استاد ہونے کی بحث میں پڑے بغیر، ہم یہ کہیں گے کہ اسے ایسا شخص ہونا چاہیئے جسے نظریہ کا شعور ہو، اپنا کام جانتا ہو اور اساتذہ، طلبہ اور انتظامیہ سے مؤثر رابطہ رکھ سکے۔ اس کے انتخاب میں اصل معیار مدت ملازمت نہیں بلکہ اس کے منصب کے لئے اس کی موزونیت ہو اور موزونیت ان اجزاء سے عبارت ہو جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔

۹۔ تعلیمی انتظامیہ کا تعلق براہ راست تہذیب سے ہے یقیناً اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مملکت کی تعلیمی پالیسیوں کے تعین میں اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں علما سے دخل حاصل ہو جاتا ہے اور پالیسی بنانے والے ان کی ہمارے، مشورہ اور تجاویز پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔ انتظامیہ کو افسران اساتذہ اور معاشرے کے افراد پر مشتمل کرنے کی ہماری بنیادی تجویز اس لئے بھی ہے کہ پالیسی

میں انتظامیہ کا دخل انتظامی نقطہ نظر سے نہ ہو اور اساتذہ اور معاشرہ کے دیگر ذریعے دوسرے پہلو بھی مناسب اہمیت سے سامنے رہیں۔

۱۰۔ تعلیمی انتظامیہ کا ایک پہلو تعلیمی اداروں (اسکول، کالج، جامعات) کے براہ راست انتظام کے علاوہ ایسے اداروں کا قیام اور ان کا انتظام ہے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔ ان میں سب سے اہم تعلیمی تحقیق کے ادارے ہیں جن کو نظریاتی نظام تعلیم میں قدرتی طور پر غیر معمولی اہم مقام حاصل ہوگا۔ اسلامی نظام تعلیم جب بھی قائم ہو، اسے قائم کرنے اور صحیح رخ پر چلانے کے لئے یہ ادارے موثر رول ادا کریں گے۔ ان کے لئے راہنما اصولوں کا تعین اور مناسب افراد کا انتخاب کیا جائے گا۔ نتائج تحقیق سے عملی طور پر فائدہ اٹھانے کا میکنزم بنایا جائے گا۔

۱۱۔ آخری نکتہ یہ ہے کہ تعلیمی انتظامیہ کی تشکیل میں اس قدر کا عملی اظہار ہونا چاہیے کہ مرد اور خواتین کے میل جول کے مواقع فراہم نہ ہوں۔ اس مقصد سے طالبات کے تعلیمی اداروں کے لئے علیحدہ تعلیمی انتظامیہ جو خواتین پر مشتمل بنائی جائے گی۔ اس کے تقرر انتخاب، تشکیل میں بنیادی طور پر وہ تمام اصول کارفرما ہوں گے جن کا تذکرہ کیا گیا۔ کسی اعلیٰ سطح پر محدود کا لحاظ رکھتے ہوئے باہمی مشورہ کا ادارہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

۷۔ معاشرہ

معاشرہ ایک وسیع تصور ہے اور تعلیم سے اس کے تعلق کی کچھ جہتیں مختلف مقامات پر زیر بحث آتی ہیں۔ یہاں ہم صرف اس پہلو سے بحث کریں گے کہ تعلیمی اداروں کے انتظام و انصرام اور روزمرہ کارکردگی میں اس کا مثبت دخل ہونا چاہیے۔

کوئی تعلیمی ادارہ جس علاقے کی ضروریات پورا کرتا ہو — ایک پرائمری اسکول کسی دیہات کی، ہائی اسکول کسی قصبے کی، یا شہر کے کسی علاقے کی، اسی طرح کالج اور جامعہ وسیع تر دائرہ ہیں — اس علاقے کا اور تعلیمی ادارہ کا باہمی رابطہ، اسلامی نظام تعلیم کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہے۔ ایسا معاشرہ اسلامی نہیں کہا جاسکتا جس کے افراد کو اپنے تعلیمی اداروں کی فکر نہ ہو، انہیں حکومت کے رقم و کرم پر چھوڑ دیں اور ان کی برائی اور بھلائی سے بے نیاز ہو جائیں۔

تعلیمی ادارے اور ان کے علاقوں کے اہل الرائے ہونا چاہئیں افراد اور زیر تعلیم طلبہ کے والدین کے باہمی ربط کے لئے مستقل نوعیت کے ادارے اسلامی نظام تعلیم کا جزو ہوں گے۔ تعلیمی ادارہ میں تعلیم و تربیت کے عمل کے بار آور ہونے کے لئے گوزنگ باڈیز اور والدین اساتذہ انجمنوں کو سرگرم ادارے ہونا چاہئیں۔ حکومت کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا ہے کہ وہ آخری مرحلے تک اپنی ہدایات و احکامات کی بجا آوری کی براہ راست ملازمین سرکار کے ذریعے ایسی نگرانی کرے جیسا کہ نگران کا حق ہے لیکن تعلیم کو قرار واقعی اہمیت دینے والی ایک اسلامی حکومت جس کے عامل اور افراد معاشرہ کے درمیان باہمی اعتماد کی فضا اور مقاصد کی ہم آہنگی ہو، ایسے ادارے ضرور سرگرم کار کر سکتی ہے جو ہدایات کو محض نافذ کرنے والے نہ ہوں بلکہ رکاوٹیں پیش آنے پر، کاغذ پر جواب دینے کے بجائے اپنے جذبہ تعاون کی مدد سے ان کو عبور کریں۔ اس طرح ایک ایسا نردکار نظام وجود میں آسکتا ہے جو تعلیمی ادارے کے بے شمار مسائل موقع پر ہی حل کرے۔ مسئلہ صرف مسائل حل کرنے کا نہیں ہے بلکہ اپنی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے عمل میں شریک ہونے کا ہے۔ افراد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس میں جذبہ شوق سے شریک ہوں اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ افراد میں جذبہ شوق پیدا بھی کرے اور اسے مناسب رستہ بھی دے۔ اسی طرح ایک ایسا فطرہ، نظام وجود میں آئے گا جس میں ہر شریک اپنا حصہ ادا کرے، اپنے فرائض کی ادائیگی کا اطمینان اور اجر بھی حاصل کرے اور تعلیم و تربیت کی شکل میں اس کے مفید ثمرات سے فائدہ بھی اٹھائے۔

۱۵۔ افضل حسین "فن تعلیم و تربیت" دہلی، لاہور۔

۱۶۔ اس پر نسبتاً "تفصیلی گفت گو علیحدہ حصے میں ہوگی۔

7- Syed Ali Ashraf "Crisis in Muslim Education" (London) p.112.

۸۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی "علمی تحقیقات: کیوں اور کیسے؟" (۱۹۶۳ء) ادارہ معارف اسلامی کراچی۔

(Ahmed Von Denffer "Research in Islam; basic principles and practical suggestion"(1983) Islamic Foundation, (U.K)

9- Syed Ali Ashraf _____ op cit _____.

۱۰- سید ابوالاعلیٰ مودودی "تعلیمات" ص ۹۵، ۹۶

11- Syed Hossain Nasar "Teaching of Philosophy".

۱۲- پروفیسر عبد الحمید صدیقی "اسلام کا فلسفہ تاریخ" "انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام" "ایمان اور اخلاق" اور "انسانیت کی تلاش"۔

۱۳- سید ابوالاعلیٰ مودودی "اسلامی ریاست" مرتبہ: پروفیسر خورشید احمد، اور امین احسن اصلاحی "اسلامی ریاست"۔

۱۴- پروفیسر عظمت اللہ خان "موجودہ نصاب معاشیات اور نظریاتی ضرورت"۔

۱۵- سید ابوالاعلیٰ مودودی "تعلیمات"

۱۶- ایضاً"۔

۱۷- پروفیسر ارشد جمیل "قرآن کریم اور نباتیات و زراعت کی تدریس"

۱۸- ڈاکٹر عبد السبع "کیمیا کی تدریس اسلامی نقطہ نظر سے" -- اور -- مسلم سجاد "حیوانیات کی تدریس اسلامی نقطہ نظر سے" انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد۔

۱۹- سید ابوالاعلیٰ مودودی "علمی تحقیقات: کیوں اور کیسے؟"

۲۰- پروفیسر محمد عثمان "نئے تعلیمی تقاضے" (۱۹۷۵ء) نیشنل بک فاؤنڈیشن، ص ۱۶۰۔

۲۱- ایضاً" ص ۲۰، ۹۷

۲۲- افضل حسین ----- ایضاً" --- ص ۵۴۵۔

۲۳- محمد اکرم خاں "اسلام کا تصور تفریح" (ماہ نامہ "چراغِ راہ" جنوری ۱۹۷۰ء)۔

۲۴- پروفیسر محمد عثمان - ایضاً" ----- ص ۲۹، ۳۱۔

چند اہم امور



اس باب میں تعلیم کے بعض ایسے پہلوؤں پر گفتگو کی جائے گی جو اسلامی نقطہ نظر سے منفرد اہمیت رکھتے ہیں۔ دنیا کے کسی ایک عام ملک کے نظامِ تعلیم میں ان کی شاید اتنی اہمیت نہ ہو لیکن اسلام کی تہذیبی اقدار انہیں ایک خصوصی مقام دیتی ہیں۔ کچھ موضوعات وہ ہیں جنہیں عام مفہوم میں اسلام سے متعلق نہیں سمجھا جاتا لیکن انہیں اس باب میں شامل کر کے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ پہلو بھی اسلامی نظامِ تعلیم سے براہِ راست متعلق ہیں:

۱۔ عام خواندگی اور تعلیم بالغاں

۲۔ تعلیم نسواں

۳۔ اقامت گاہیں

۴۔ سہولتوں کی فراہمی

۵۔ تعلیمی معیار

۶۔ جدید تحقیقات سے استفادہ

۱۔ عام خواندگی اور تعلیم بالغاں

خواندگی سے کیا مراد ہے۔ اس کی فنی تعریف سے قطع نظر بالعموم مربوط عبارت کو پڑھنے اور کچھ الفاظ مکھنے کی قابلیت کو خواندگی قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک اسلامی معاشرہ میں خواندگی کی تعریف اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتی کہ انسان کے لئے اس کے خالق و مالک کی کتاب ہدایت قرآن کریم پڑھنا اس

میں شامل ہو۔ جن ملکوں میں قرآن کی زبان ہی قومی مادری زبان ہو وہاں عربی پڑھنے والے اور محوِ طراہت عربی لکھنے والے کو خواندہ قرار دیا جاسکتا ہے لیکن جن مسلم ممالک میں عربی قومی یا مادری زبان نہیں ہے وہاں قرآن پڑھنا آنے کے علاوہ قومی یا مادری زبان میں پڑھنے کی اور کچھ لکھ لینے کی ہمارت ہی کی بنیاد پر کسی مرد یا عورت کو خواندہ قرار دیا جائے گا۔

بلاشبہ ایک ناخواندہ شخص بھی ایمان لاتا ہے اور ایمان خواندگی کے ساتھ مشروط نہیں ہے اس لئے کہ علم کا وسیلہ صرف لکھا ہوا لفظ ہی نہیں ہے، لیکن زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ لکھے ہوئے لفظ کا اہمیت بڑھتی گئی ہے اور آج ایک ناخواندہ شخص کو عرف عام میں جہالت کے اندھیروں میں مبتلا سمجھا جاتا ہے۔ خواندگی کے ذریعے دراصل اس پر دنیا کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ دنیا میں اور اس کے واسطے سے آخرت میں دینی کامیابی کے راستے پر زیادہ آسانی سے چل سکتا ہے۔

ایک مثالی اسلامی معاشرہ کو سو فیصد ناخواندہ افراد پر مشتمل ہونا چاہیے۔ یہ مثالی صورت حال نہ ہوتی بھی اس تک پہنچنے کی مسلسل سعی جاری رہنا چاہیے۔ بد قسمتی سے بیشتر اسلامی ممالک میں اس لحاظ سے افسوسناک صورت حال موجود ہے۔ یہ نوابداتی دور کا ورثہ ضرور ہے لیکن مسلمان ممالک نے حصول آزادی کے بعد بھی یہ نہیں کیا ہے کہ اولین ترجیح دے کر اپنے معاشروں کو اسلامی نقطہ نظر سے ناخواندہ معاشرہ بنا دیتے اور اس طرح دین و دنیا کے فائدے حاصل کرتے حقیقت یہ ہے کہ کسی مسلم معاشرہ کے لئے اس کا جواز نہیں ہے کہ اس کے افراد مرد ہوں یا عورت، ناخواندہ رہیں، اگر حکومت اپنے فرض میں کوتاہی کرے تو معاشرہ کے ذمہ دار افراد کا یہ ذریعہ ہے کہ وہ باہمی تعاون سے ایسے انتظامات کریں اور ایسی تحریک برپا کریں کہ علم کی روشنی گھر گھر پہنچے اور کوئی مسلمان مرد یا عورت ناخواندہ نہ رہے۔

خواندگی کو عام کرنے کے دو پہلو ہیں :

- ۱۔ ابتدائی تعلیم کو لازمی کرنا، اس کے لئے مناسب سہولت فراہم کرنا اور اس امر کو یقینی بنانا کہ کسی اسلامی ریاست کے تمام بچے ابتدائی تعلیم کے اداروں میں داخل ہوں اور تعلیم مکمل کر کے نکلیں۔
- ۲۔ موجودہ ناخواندہ بانٹوں کو ایک ہم کے ذریعہ کسی متعینہ مدت میں ناخواندہ بنانا۔

اس حصے میں صرف دوسرا پہلو ہمارے مطالعہ کا موضوع ہے۔

تعلیم بالغاں کا ہدف معاشرہ کی وہ کثیر آبادی ہے جو موجودہ صورت حال میں کسی قسم کی رسمی تعلیم سے محروم رہی ہے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتی۔ انسان ہی معاشرہ کا اصل اور حقیقی سرمایہ ہیں، (ترقی) کا بیانیہ اور اسلامی تشکیل کے تمام منصوبے ان کو ساتھ لئے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے ہر شخص مرد یا عورت خدا کی طرف سے صلاحیتوں کا خزانہ لے کر پیدا ہوا تھا لیکن ان کے والدین نے، معاشرہ نے اور حکومت نے یہ انتظام نہ کیا کہ ان کو تعلیم و تربیت کے ایسے مواقع ملنے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو نکھارتے، جلا دیں اور انہیں اپنی دنیا و آخرت کے لئے اور اس طرح اپنے معاشرے کے لئے بہترین طور پر استعمال کرتے۔ اس طرح دراصل یہ خزانے مدھون پڑے ہیں اور ان کا حصول اسلامی مملکت کا ہدف ہے۔

کسی مسلم مملکت کی اسلامی قیادت جب تعلیم بالغاں کی ہم شروع کرے تو وہ بنیادی طور پر بھی اور اپنی تفصیلات میں بھی اس سے مختلف ہونا چاہیے جو آج کے دور کے بین الاقوامی ادارے تیسری دنیا کے ممالک کے لئے تیار کر کے دیتے ہیں۔

تعلیم کے جدید ماہرین خواندگی کو معاشی ترقی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اگر معاشرتی دوسرے تبدیل کرنا پیش نظر ہوتا ہے تو وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ وہ معاشی ترقی میں آڑے آتے ہیں۔ یہ دراصل اس فکر کا پرتو ہے جو انفرادی طور پر بھی تعلیم کو محض ذریعہ حصول معاش اور اجتماعی طور پر بھی معاشی ترقی کے لئے سرمایہ کاری قرار دیتا ہے۔ فرد کے لئے حصول معاش بھی ضروری ہے اور اس کی قرآن و حدیث کی روشنی میں دینی اہمیت بھی ہے اسی طرح معاشرہ کیلئے بھی معاشی ترقی ناگزیر ہے اور اس کی دینی اہمیت بھی ہے۔ تعلیم کے ان مقاصد کے حصول میں مضبوطی سے انکار نہیں ہے لیکن مسئلہ بنیادی فکر کا ہے، اور کیونکہ تعلیم بالغاں اپنی مدت اور نتیجہ خیزی اور اثر پذیری کے لحاظ سے سربلعل ہے اس لئے اس کی منصوبہ بندی میں فکر کا اختلاف زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔

تعلیم بالغاں کے ہدف کی تکمیل ایک عارضی لیکن طویل مرحلہ ہے جس میں خواندگی کی ترویج میں درجہ بدرجہ اضافہ سے مثالی صورت حال کی طرف پیش رفت ہوتی ہے۔ اسلامی قیادت کے لئے اس کی منصوبہ بندی غیر معمولی اہمیت کی ملک ہے۔ تعلیم بالغاں کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے کسی مسلم معاشرہ کے مردوں اور عورتوں کی بالغ آبادی کی اکثریت سے (اگر اکثریت ناخواندہ ہے جیسا کہ اس

وقت بالعموم ہے، بمعنی رابطہ کا اڈان کے ذہن اور فکر پر اور ان کے رویوں پر اثر انداز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ایک نظریاتی ریاست کے لئے جس کے پیش نظر اپنے مقاصد ہیں یہ اتنی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کہ ریاست کی کامیابی یا ناکامی کو اس پر منحصر قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ مسئلہ محض شرح خواندگی میں اضافہ کا نہیں ہے کہ اس طرح دنیا کی قوموں کے درمیان شرمندگی کے موجودہ مقام سے اوپر آجائیں۔ بلکہ افراد تک اس بنیادی علم پہنچانے کا ہے جس کا حصول ہر مسلمان کے لئے فرض عین ہے۔ علم کا یہ ابلاغ خیر کثیر کا منبع نہایت ہوگا۔

اس کے نتیجے میں ایک ذمہ دار مسلمان شہری کی حیثیت سے فرائض کا شعور بیدار ہونا چاہیے، اور اپنے حقوق کا بھی نظم و زیادتی کو برداشت کرنے کے بجائے اسے مٹانے کا جذبہ قوی ہونا چاہیے۔ یہ پانچ افراد کے حقوق بھی ادا کرے، عبادات بھی کرے، نفس کے خاندان اور معاشرے کے حقوق بھی ادا کرے، امت کے مسائل سے بھی آگاہ ہو، ملک کے حالات سے بھی باخبر ہو۔ سیاسی شعور بھی بیدار ہو، ووٹ کے صحیح استعمال کی اہمیت سے آگاہ ہو اور اپنے پیشہ میں زیادہ کارکردگی اور ہنرمندی سے کام کرے اس کے اثرات لامحالہ پورے معاشرہ پر پڑیں گے۔ اخبارات رسائل و جرائد کی اشاعت میں اضافہ ہوگا، علمی و ادبی سرگرمیوں کو فروغ ہوگا۔ معاشی سرگرمیوں میں ایک عام بہتری رونما ہوگی۔ غرض ایک ہمہ گیر سرگرمی رونما ہوگی۔ معاشرہ میں خیر و فلاح کا دور دورہ ہوگا۔

تعلیم بالغاں کے مقاصد

- ۱۔ اسلامی معاشرہ میں تعلیم بالغاں کے درج ذیل مقاصد متعین کئے جاسکتے ہیں۔
- ۱۔ مسلمان شہری کی حیثیت سے حقوق و فرائض کی ادائیگی کا احساس بیدار کرنا۔ یہ ایک انتہائی جامع تصور ہے جو فرد کی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے۔ کوئی بھی بالغ انسان حقوق و فرائض کا کچھ نہ کچھ شعور رکھتا ہے لیکن تعلیم بالغاں کے ذریعے اس کی دینی حیثیت واضح کی جائے گی۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا تصور بنیادی عقائد توحید اور رسالت آخرت کے پس منظر میں دیا جائے گا تاکہ انسان کا مطلع نظر آخرت ہو اور اس کے کردار کے لئے حقیقی بنیاد فراہم ہو سکے۔

۲۔ نئی نسل کی اسلامی تعلیم و تربیت کی اہمیت کا احساس بیدار کرنا۔ علم کی لذت سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ ان بالغوں میں یہ خواہش اور تمنا بھی بیدار ہونا چاہیے کہ نئی نسل ان کی طرح تعلیم سے محروم نہ رہ جائے۔ ماں کی حیثیت سے باپ کی حیثیت سے، بڑے بھائی کی حیثیت سے، خاندان کے بزرگ کی حیثیت سے یا معاشرہ کے اہم فرد کی حیثیت سے وہ اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کریں اور ادا کریں کہ ان کی اولاد اور ان کے چھوٹے اسلامی تعلیم اور تربیت کے ثمرات سے بہرہ ور ہوں۔

۳۔ حالات حاضرہ سے باخبر رہنا۔ پڑھنا سیکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر یہ شوق بھی پیدا ہو کہ وہ مسلم اُمت اور اپنے ملک کے حالات و مسائل سے آگاہ ہوں۔ یہ آگاہی اور باخبری ان کی بامقصد شرکت کی بنیاد بنے گی۔ خواندہ ہونے کے ساتھ ان میں اخبارات و رسائل پڑھنے کی عادت بھی ہونا چاہیے جس سے ایک طرف ان کی خواندگی کی صلاحیت ان کے لئے نئے نئے راستے تلاش کرنے کا باعث بنے اور دوسری طرف ان کو حالات سے باخبر کر کے مسلمان شہری کی ذمہ داری ادا کرنے کے قابل بنائے۔

۴۔ علمی اور ذہنی افق وسیع کرنا۔ خواندگی کی ہمارے اس طرح پیدا کی جائے کہ یہ مقصد حاصل ہو۔ انسان نے خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو کچھ کیا ہے نہ صرف اس کی ایک جھلک دیکھنا بلکہ دنیا میں خدا کی نعمتیں انسان کیلئے جس جس شکل میں پیدا کی گئی ہیں ان کا علم کی بنیاد پر ادراک ذہنی افق کو وسیع کرے اور انسان کا اپنے خالق پر ایمان بھی تازہ اور قوی ہو۔

۵۔ کسی ہنر کی ہمارے سکھانا۔ تعلیم بالغاں کا یہ مقصد اس کی کسی ہنر میں نظر سے اوجھل نہ ہونا چاہیے۔ انسان جو بھی کام کرتا ہو، خواندہ ہو جانے کے بعد وہ زیادہ بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ملی و قومی مقاصد کی تکمیل کے لئے اور بالغ مرد یا عورت کی اپنی زندگی کے لئے یہ ناگزیر سمجھنا چاہیے کہ اسے کسی

نہ کسی ہنر میں اس تعلیم کے ساتھ مہارت سکھائی جائے یا کسی ہنر میں مہارت کو بہتر طور پر کارآمد بنایا جائے تاکہ وہ معاشرہ کا زیادہ بامقصد رکن بن سکے اور معاشی جدوجہد میں بھی اپنا حصہ ادا کر سکے۔

تعلیم بالغاں کے ان مقاصد کے حصول کے لئے مناسب حکمت عملی وضع کرنا ہوگی۔ تفصیلات سے احتراز کرتے ہوئے چند اہم نکات پیش کئے جائیں گے۔

اول: نصاب

۱۔ نصاب کا سب سے ضروری جزویہ ہے کہ قرآن پاک پڑھنا آئے۔ یہ کسی مسلمان مرد یا عورت کی اور اس معاشرے کی جس میں وہ رہتے ہوں بڑی بدقسمتی ہے کہ اسے قرآن پڑھنا نہ آتا ہو۔ تعلیم بالغاں کے نصاب کا اولین جزویہ ہو۔ چاہیے اور جن کو یہ آتا ہو ان کے لئے اگلے مرحلے کا نصاب ہو۔

-۲

نصاب کی تیاری میں ان مقاصد کا پورا لحاظ رکھا جائے جن کا بیان ہوا ہے۔ اس کی تفصیلات میں اسلامی تقویمات سمجھوتے ہوئے ہوں۔ حروف شناسی کے بعد جو جملے بنوائے جائیں، ہند سے سکھانے کے بعد جو ابتدائی حساب سکھایا جائے ان کی مثالوں میں اور سوالات میں اسلامی نظریہ کی عکاسی ہو۔ سائنسی ایجادات وغیرہ سے واقف کرواتے ہوئے سائنس کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر سے آگاہ کیا جائے۔ خدا اور اس کے رسولؐ سے صحیح تعلق اور روزمرہ زندگی میں اسلامی کردار کی اہمیت مختصر دلنشین آیات اور احادیث کے ذریعے بیان کی جائے۔ تاریخ اسلام کے واقعات اور عالم اسلام کے حالات اس طرح بیان ہوں کہ دنیا میں اسلام کو از سر نو غالب کرنے کا جذبہ بیدار ہو۔

۳

نصاب کی تشکیل میں یہ لحاظ رکھا جائے کہ پڑھنے والے مرد ہیں یا عورت۔ تعلیمی نفسیات کے لحاظ سے یہ قابل قبول نہ ہونا چاہیے کہ دونوں کے لئے

ایک جیسا نصاب ہو۔

جنس مختلف ہونے کی بنیاد پر، شارع علیہ السلام نے اسلامی معاشرہ میں ان کے فرائض اور حقوق میں جو فرق رکھا ہے، ان کے لئے نصاب بنانے میں پیش نظر رہنا چاہیے۔ ان کے لئے علیحدہ کتب لکھی جائیں۔ نہر میں مہارت کے لئے ایک فہرست مشترک ہو اور دونوں کے لئے ایک فہرست علیحدہ ہو جن میں تربیت دی جائے۔

۴۔ نصاب کی تشکیل میں جس دوسری حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے وہ پڑھنے والوں کا دیہی یا شہری پس منظر ہے۔ ناخواندہ ہونے میں مشترک ہونے کے باوجود کسی بھی ملک کے شہر یا دیہات کے رہنے والوں کی ذہنی سطح اور ذہنی افق میں فرق ہو سکتا ہے۔ نصاب میں اس کا لحاظ تعلیم بالانہاں کی ہم کی قبولیت اثر پذیری اور کامیابی کا سبب بنے گا۔

دوم، سمعی و بصری اعانات

سمعی و بصری اعانات کی عام تعلیم میں بھی اہمیت ہے۔ نین تعلیم بالانہاں میں اس کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ انہیں بہترین معیار پر بہترین انداز سے جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے اپنی ضروریات کے لحاظ سے ہر ملک کو تیار کرنا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہیے۔ نہ صرف شوق پیدا کرنے کے لئے، تعلیم کے عمل کو دلچسپ بنانے کے لئے بلکہ اسے زیادہ مفید اور بار آور بنانے کے لئے ان کا استعمال ضروری ہے۔ ان کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اصل نصاب کو پڑھانے میں مدد ملی جائے۔ بلکہ اس تعلیم کے جو مقاصد پیش نظر ہیں ان کا حصول بھی ممکن بنایا جائے۔ ان کو زیادہ وسیع تناظر میں تیار کیا جائے۔ ان کی تیاری میں اور پیشکش میں اسلامی اقدار نمایاں ہوتی ہوں۔

سوم : عملہ

مقاصد کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں کہ عملہ کی مناسب تربیت کی گئی ہو۔ عملہ میں وہ بھی شامل ہیں جو میدان میں تعلیم دینے کے عمل میں مشغول ہوں اور وہ بھی جو اس ہم کے پورے انتظام کے ذمہ دار ہوں۔ — تعلیم بالغاں کے ذریعہ اسلامی ریاست جس فکر اور جن انداز کی اپنے شہریوں میں ترویج چاہتی ہے عملہ کی عملی زندگی میں اس کی مکمل پاسداری نظر آنی چاہیے خواتین اور مرد عملہ کی تربیت کے انتظامات مکمل طور پر علیحدہ ہونا چاہیے۔

اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ خواتین کسی ملک کی آبادی کا تقریباً نصف ہیں، تاریخی اور معاشرتی وجوہات سے ان میں ناخواندگی کی اوسط مردوں سے زیادہ ہے، ان کی ناخواندگی معاشرے کی عام بہتری اور تعلیم و تربیت کے نقطہ نظر سے نسبتاً زیادہ اہمیت رکھتی ہے، تعلیم بالغاں کی کسی ہم کو خواتین کی طرف خصوصی توجہ کرنا چاہیے۔ اور خواتین عملہ کو اس تعداد میں اور اس معیار کی تربیت دی جائے کہ ضرورت پوری ناخواندہ خواتین کو تعلیم دینے کی ذمہ داری خواتین عملہ کو سنبھالنا ہوگی۔ اس ہم کے کی منصوبہ بندی میں نصاب، امتحانات اور عملہ کے علاوہ بھی کئی عوامل پیش نظر رکھے جانا چاہیے۔ بالغوں کو اس میں شرکت کے لئے آمادہ کرنا بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کی ترغیب کے لئے انعامات بھی رکھے جاسکتے ہیں اور بالآخر جرمانے بھی کئے جاسکتے ہیں۔

اس کا دورانیہ کتنا ہو، اس کے مراکز کہاں بنائے جائیں۔ یہ سب وہ تفصیلات ہیں جو ہر ملک اپنے حالات کے لحاظ سے طے کر سکتا ہے لیکن جو بات کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی اسلامی ریاست اس ہم کی ناکامی کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے ضروری قانون سازی اور فراہمی وسائل حکومت کی ذمہ داری ہے اور دیکھنا یہی ہے کہ اس کے لئے درست منصوبہ بندی ہو، تیاری ہو اور اس پر اس طرح عمل ہو کہ مقاصد حاصل ہوں۔

۲۔ تعلیم نسواں

کسی اسلامی معاشرہ میں تعلیم نسواں کی ضرورت نامہیت پر دو رائے نہیں، میں قرآن کریم کی آیات، رسول اللہ کے فرمودات، آپ کا اپنا اور صحابہ کا طرز عمل، مسلم معاشروں کا تعامل اور مسلمانوں کی تاریخ کی گواہی سب اس باب میں یک رائے ہیں۔ عورتوں کو تعلیم سے بلے بہرہ رکھنا انہیں دراصل مرتبہ انسانیت سے بھی گرانا ہے اور اسلام اس کی ناپسند نہیں کر سکتا۔ لیکن آج کے دور کے پس منظر میں اس مسئلہ نے مسلمان معاشروں کے لئے خصوصی اہمیت اختیار کر لی ہے اور یہ بحث کا تھنا کرنا ہے۔

مسلمانوں کے حقیقی اسلام سے دور ہونے اور ایک طویل دور غلامی کے نتیجے میں دو طرح کی صورتحال پیدا ہوئی۔

مسلمانوں کی بعض بڑی بڑی آبادیوں میں خواتین تعلیم سے عملاً محروم رکھی جانے لگیں۔ ان سے ان کے سب حقوق چھین لئے گئے اور انہیں ایک حقیر اور کم تر مقام دیا گیا جہاں ان کی اپنی آزاد حیثیت عملاً ختم کر دی گئی اور انہیں اپنے مردوں کا غلام بنا کر لیا گیا۔ دور جدید کی ہر بات کو نامطلوب قرار دے کر کوشش کی گئی کہ عورتوں کو اس کی ہوا بھی نہ لگے۔ یہ کسی بھی طرح اسلام کا منشاء تھا لیکن چونکہ مسلمانوں کا عمل تھا اس لئے غیروں اور بعض اپنوں کی نظر میں بھی اسلام کے کھاتے میں ہی ڈالا گیا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ عورتوں کی یہ جہالت دراصل مسلمانوں کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے۔

دوسری صورت حال یہ سامنے آئی کہ عورتوں کو جدید تعلیم فراہم کی گئی اور اس کے ساتھ ہی مغربی معاشرہ میں عورت کو جو مقام دیا گیا ہے اسے بھی صحیح تسلیم کر لیا گیا اور فکر و عمل دونوں دائروں میں اسلامی اقدار کو پس پشت ڈال کر مغربی اقدار حیات کو برضا و رغبت اختیار کر لیا گیا۔ اور نظام تعلیم نے بھی ان اقدار کو مکمل طور پر اپنا لیا۔ اس کا ایک مظہر مخلوط تعلیم ہے جو مسلمان مکوں میں بھی روانہ ہو گئی۔ اس پس منظر میں آج کے معاشرہ میں جب اسلامی نظام تعلیم کے تصور کے تحت تعلیم نسواں کے مسئلہ پر غور کیا جاتا ہے تو یہ مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں:

- ۱۔ جدید اسلامی معاشرہ میں عورت کا حقیقی مقام کیا ہے؟
- ۲۔ اسلامی معاشرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تعلیم نسواں کا کیا انتظام

۳۔ اسلامی معاشرہ میں عورتوں کے لئے تعلیم کے بعد ملازمت اور کام کے کما میراث ہوں اور کیا نظام تعلیم اس کے لئے تعلیم و تربیت فراہم کرے گا۔

جدید معاشرہ نے عورت کو جو مقام دیا ہے وہ مساوات مرد و زن کے نظریہ پر مبنی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ کئی عسٹرن کی جدوجہد کے بعد خود جدید دنیا میں اس پر حقیقی عمل کی صورت حال کیا ہے اور اس سے بھی قطع نظر کہ اس پر نسل کے کیا نتائج ان معاشرہ میں رونما ہو رہے ہیں، بدیہی طور پر یہ ایک غیر فطری نظریہ ہے۔ اس میں عورتوں اور مردوں کے حیاتیاتی، نفسیاتی و منصب و مقام کے فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بہر حال یہ ایک غالب تہذیب کا نظریہ ہے۔ رائج الوتھ ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ اس کے تحت عورتوں کو آزادی ملی ہے۔ ان کی غلامی کا زنجیریں کٹ گئی ہیں۔ وہ قوم کے اجتماعی معاملات میں شانہ بنانا شریک کرتی ہیں۔ ہر طرح کے پیشہ اور ملازمت میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔

اسلامی معاشرہ نے عورت کو جو مقام دیا ہے وہ یہ ہے کہ اسے گھر میں ٹکنے کو کہا گیا ہے۔ (وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ لَا تَخَرْنَ سِرَاتِ الْإِنْسَانِ) (النساء: ۳۴) مرد کو ان پر قوام بنایا گیا ہے (الزَّيْحَانُ قَوْا صَوْتَهُنَّ) (النساء: ۵۸) کسب معاش بنیادی طور پر مرد کی ذمہ داری ہے اور اموال خانہ داری خواتین کے سپرد رکھے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں حجاب و حیا کی حد کا پابند کیا گیا ہے۔ لیکن ان کی انفرادی اور آزاد حیثیت برقرار رکھی گئی ہے۔ ان کے حقوق کو قانونی تحفظ دیا گیا ہے۔

اس پس منظر میں ہمیں یہ یقین کرنا ہے کہ جدید اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام کیا ہے۔ معاشرہ کتابی جدید کیوں نہ ہو جائے، انسان کو جس فطرت پر اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور تبدیل نہیں ہو جاتی اسی طرح مرد و عورت کی ساخت اور حیاتیاتی و نفسیاتی ضروریات میں جو فرق ہے وہ بھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ان حقائق سے آنکھیں بند کر لینے سے حقائق تبدیل نہیں ہو جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کے نتیجے میں عملی نقشہ کیا بنے گا۔

اس عملی نقشہ کا تصور واضح کرنے سے پہلے دو بنیادی باتیں سمجھ لینا چاہئیں۔

• کسی معاشرہ کی مجموعی کارکردگی اور اس کے فزوفلار میں اس کو بڑا دخل ہے

کہ مجموعی طور پر اس کی خاندانی دھڑوں زندگی مطمئن اور سکھی ہے۔

• ہر فرد اپنے اپنے منصب پر کام کر کے معاشرہ کے فزوفلار میں اپنا

حصہ ادا کرتا ہے۔

کسی منصب پر متعین ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس فرد کے انسان اور معاشرہ کا ایک عمومی رکن ہونے کی حیثیت ختم ہو گئی ہے اور کسی دوسرے کام میں شرکت اس کے لئے مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ اگر مرد گھرداری میں ہاتھ بٹائیں یا عورتیں بعض باہر کے کام انجام دیں تو اس سے ان کی فطرت کی نفی نہیں ہوتی۔

ان امور کی روشنی میں ہم ایک ایسے جدید اسلامی معاشرہ کا تصور کر سکتے ہیں جہاں مردوں اور عورتوں کی ایک مشترک حیثیت ان کے انسان ہونے اور معاشرہ کی عمومی رکن ہونے کی ہو اور دوسری حیثیت ان کے اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی کرنے والے کی ہو۔ فرائض میں فرق کی وجہ سے نہ کسی کو کمتر قرار دیا جائے اور نہ برتر۔ اور اسلامی احکامات کی پاسداری کرتے ہوئے معاشرے کی فزول و فلاح کیلئے اپنی شخصیت و فطرت کے مکمل اظہار کی خاطر کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے تو اس پر کوئی پابندی نہ ہو۔ منصب و مقام کے اس نعتن کے بعد (جو کسی مسلم معاشرہ میں عملاً موجود نہیں ہے۔ کہیں افراط ہے کہیں تفریط ہے) یہ طے کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کو عورتوں کی تعلیم کے لئے کس نوعیت کی سہولت فراہم کرنا چاہیئے۔ یہاں اس صراحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یہ سوچ کہ عورتوں کو تعلیم نہ دی جائے (کہ وہ اسی طرح خود سر ہو جائیں گی جس طرح وڈیرے اور جاگیردار اپنے مزارعوں کی تعلیم میں رکاوٹ بنتے ہیں) ایک غیر اسلامی سوچ ہے۔ اس طرح کی فکر رکھنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کو اپنے اسلام کے بارے میں سوچنا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک یہ عورتوں سے بدسلوکی ہے۔ اس پر وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وعید کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ ان کو تعلیم دینا ان کے ساتھ اس حسن سلوک کا ایک حصہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے رسول نے جنہاں کو شجرہ دی ہے ایک اسلامی ریاست کو یہ اہتمام کرنا ہوگا کہ اس کا کوئی باشندہ تعلیم سے محروم نہ رہے اور عورتوں کی تعلیم اس لحاظ سے خصوصی اہمیت رکھتی ہے کہ ایک عورت کی تعلیم کا اثر پورے خاندان کو ملتا ہے۔

عورتوں کو تعلیم دینے سے ان میں ان فرائض و حقوق کا شعور پیدا ہوگا جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیئے ہیں اور ان میں یہ حوصلہ بھی پیدا ہوگا کہ اگر یہ حقوق ان کو نہ دیئے جا رہے ہوں (مسیا کہ اس وقت صورت حال ہے) تو وہ انہیں حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کریں اور مسلمانوں کے غلط طرز عمل کو

اسلام سمجھنے کا امکان نہ رہے۔

اسلامی ریاست کا نظام تعلیم اپنی ترجیحات کے تعین میں محض معاشی خوشحالی کو فہرست میں نہیں رکھتا بلکہ اپنے باشندوں کی زندگی کو احکامات الہی کی روشنی میں پرسکون اور آخرت کے دن کے لئے کامیاب بنانے کے مواقع فراہم کرنے کو اولیت دیتا ہے۔ اسی نقطہ نظر سے عورتوں کی تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دی جائے گی اور اس کے لئے وسائل کی کمی کو عذر نہ بنایا جائے گا۔

۲۔ اب ہم اس مسئلہ کے اس پہلو کی طرف آتے ہیں کہ تعلیم نسواں کا نظام کیا ہو اور کس طرح کام کرے۔

اس وقت جو نظام تعلیم رائج ہے وہ مغرب کے اسی نظریہ مساوات مرد و زن پر مبنی ہے جو عورتوں اور مردوں میں کسی تفریق کا قائل نہیں، اس لئے ان کی تعلیم بھی یکساں نوعیت کی ہوتی ہے عملاً مغربی ممالک میں بھی فطری رجحانات یا معاشرے کی ضروریات کے سبب عورتیں کچھ خاص مضامین یا ہارتوں کی طرف زیادہ راغب ہوتی ہیں اور مسلم ممالک میں تو جیسی کچھ بھی تہذیبی و ثقافتی اقدار یا موجود ہیں، ان کی وجہ سے عورتوں کی مردوں جیسی تعلیم کسی کام نہیں آتی، یہ صورت حال بذات خود تعلیم نسواں کی اشاعت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

اسلامی معاشرہ کا فریضہ ہے کہ اپنی خواتین کے لئے اس تعلیم کا انتظام کرے جس کی انہیں ضرورت ہے وہ اگر ایک دائرہ میں اس سے مشترک ہے جو مردوں کو راجح ہے تو ایک دائرہ میں اس سے مختلف ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق ابتدائی مرحلہ میں یہ تعلیم مکمل طور پر مشترک ہو سکتی ہے لیکن تاویں مرحلہ سے مشترک حصہ کے ساتھ ساتھ عورتوں کے لئے خصوصی مضامین اور کورسز کا انتظام بھی کیا جانا چاہئے۔ تاویں کے بعد کے مرحلہ میں اس نوعیت کے ایسے اداروں کا جال پھیلا دیا جائے گا جہاں تربیت پاکرد، ملازمت کرنے کی پابند نہ ہوں بلکہ گھر میں اپنے خرائش خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں اور اس سے ان کی تعلیم و تربیت میں سرمایہ کاری کا مفید نتیجہ سمجھا جائے گا۔ ان اداروں کے لئے نصابیات میں فطری طور پر ان کی شخصیت و نفسیات اور ان کے بعد کی زندگی کے فرائض کا خیال رکھا جائے گا۔ اس میں ایک نصاب ایسا ہو سکتا ہے جس میں خواتین کے منصب اور حقوق و فرائض پیش کئے جائیں۔ دائرہ زوجیت اور فریضہ اہمیت کے متعلق اسلامی حکمت عملی اور اس کے ساتھ احکام مذکور ہوں گے۔ تاریخ اسلام میں قرون الہی سے اب

تک خواتین کے ایمانی، اخلاقی، علمی و فکری اور تعلیمی و نفسی بگاڑا ہے۔ بیش کیے جائیں گے۔ نیز مغرب کی تحریک آزادی نسواں، ترقی نسواں اور مساوات مرد و زن کے نظریے کا ناقدانہ مطالعہ کیا جائے، پردے کے موضوع پر عقلی تجربات اور شواہد کی روشنی میں دینی احکام کی حکمت و مسحت کو اجاگر کیا جائے۔ اس کے علاوہ ڈومسک سائنس خانگی علوم کے موجودہ نصابات کو نظر باقی آہنگ دے کر پڑھایا جائے گا۔ اس میں ضروری طبی معلومات، گھریلو معاشیات، اسلامی، کھدائی کے دائرے شامل کئے جاسکتے ہیں۔

اسلامی نظام تعلیم میں خواتین کی تعلیم کا یہ انتظام اس مغربی نکر کے بالکل برعکس ہے جہاں یہ پریشانی ہے کہ ابتدائی درسی کتب سے ہی عورتوں اور مردوں کے دل کا فرق بالکل ظاہر نہ ہونا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ دل کا عملی فرق اسی طرح کسی غلط تعلیم کا اثر ہے۔ اگر طالب علم کو مرد و عورت کے دل کا فرق ابتداء سے انہماک تعلیم کے کسی مرحلہ میں بھی نہ بتایا جائے تو بعد کی زندگی میں بھی عورت و مرد کیلئے کسی مخصوص کام کی تفریق نہ رہے گی۔

۲۔ کیا اسلامی معاشرہ میں خواتین کے لئے ملازمت کے مواقع ہوں گے اور کیا اس کی مناسبت سے تعلیم و تربیت فراہم کی جائے گی۔

اس سوال کا عمومی جواب تو اوپر آچکا ہے لیکن اس کی غیر معمولی اہمیت تفصیلی جواب کا تقاضا کرتی ہے۔

بلاشبہ عورت مرد میں کسی تفریق کے بغیر عورتوں کے لئے ہر طرح کی ملازمت کے نہ صرف مواقع فراہم کرنا بلکہ ان کے ملازمت نہ کرنے کو قوی ترقی میں ان کی عدم شمولیت قرار دینا اور گھر بیٹھنے کی پسماندگی سمجھنا اسلامی طرز فکر نہیں۔ اسی لئے کہ اس طرح وہ معاشرہ قائم نہیں ہوتا جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں عزت و احترام سے رہیں، ان کے حقوق مکمل طور پر ادا کئے جائیں۔ زندگی کی تمام سہولتوں میں وہ برابر کی شریک ہوں اور اجتماعی سرگرمیوں میں حد و اسلامی کے ساتھ شرکت کریں۔ یہی حکومت کی پالیسی ہونا چاہیے۔ گھروں میں رہ کر موفانہ داری انجام دینے والی اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں اپنا حصہ ادا کرنے والی خواتین کو معاشرہ میں عزت و مرتبہ کا مقام دیا جائے گا۔ اور نظام تعلیم و تربیت میں اس کی مکمل بنیائیں ہوں گی کہ خواتین ان امور کی انجام دہی

کے لئے بہتر سے بہتر طور پر تیار ہوں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں کے لئے باہر نکلنا یا باہر نکل کر کام کرنا یا حصول معاش کرنا یا حصول معاش میں تعاون کرنا منع ہے۔ جو چیز منع ہے وہ حد کو توڑنا ہے۔ حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر کام کی اجازت اور گنجائش ہے۔

۱۔ یہ اجازت جدید معاشرہ کے ایک اہم مسئلہ کو حل کرنے کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ جو معاشرتی خدمات عورتوں کے لئے فراہم کی جاتی ہیں اسلامی اقدار کے تحت قائل ترجیح یہ ہے کہ وہ عورتوں کے ذریعہ ہی فراہم ہوں۔ پورے ملک میں لڑکیوں کی ہر مرحلہ پر تعلیم و تربیت کے لئے خواتین اساتذہ اس کے انتظام و انصرام کے لئے خواتین کارکن، اسی طرح خواتین کے علاج معالجے کے لئے خواتین معالج اور ان سے منسلک علم، ان سب کی تعلیم و تربیت کا انتظام اسلامی نظام تعلیم کا جزو ہونا چاہیے اور یہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے والی خواتین اسلامی معاشرہ کی مسلمان خواتین ہوں گی۔

۲۔ عورتوں کا حصول معاش میں حصہ لینا خود عورتوں کے اپنے بعض مسائل کا حل ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ کل زندگی اس میں گزاریں۔ حالات کے تحت زندگی کے کسی خاص دور میں وہ اس میں سرگرم عمل ہو سکتی ہیں حصول معاش کی سرگرمی ان کی کسی مجبوری کے سبب بھی ہو سکتی ہے اور تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں اپنی کسی صلاحیت اور قابلیت کو اپنے لئے اور معاشرہ کے لئے نفع بخش طور پر استعمال کرنے کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔ دونوں صورتوں میں کوئی قباحت نہیں ہے اگر اسلامی حدود کا لحاظ رکھ کر کام کیا جائے اور یہ نہ ہو کہ مرد اور عورتیں اپنی فداقتی کے لئے سامان فراہم کریں۔

۳۔ کسی خاص مرحلہ پر قومی منصوبہ بندی کے تقاضے کے طور پر بھی تعلیم یافتہ خواتین کی گھر سے باہر کے دائرہ کار میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اگر ملک کی ناخواندہ خواتین کو خواندہ بنانے کی ہم ہے، کسی علاقے کی خواتین کے لئے قرآن کی تدریس اور دینی علوم کی اشاعت کا نظم بنانا ہے تو ایک پروگرام کے تحت خواتین گھر سے باہر مصروف کار ہوں گی۔

۴۔ خواتین کے نقطہ نظر سے کسی معاشرہ میں کسب معاش کے لئے سرگرمی کے تین دائرے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ کام جو عورتوں کے لئے مخصوص ہیں اور کام کرنے کے دوران مردوں سے واسطہ نہیں پڑتا۔ دوسرا وہ جو عورتوں اور مردوں کے دوران مشترک ہیں اور عورتوں کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ علیحدہ

رہ کر بھی کام کر سکیں اور تیسرا وہ جو مردوں کے لئے مخصوص ہیں، نہ عورتیں وہ کام کرنے کا فطری رجحان رکھتی ہیں اور نہ انکے لئے علیحدہ رہ کر کام کرنا ممکن ہے۔ اس آخری دائرہ کے علاوہ تمام سرگرمیوں میں خواتین کی شرکت کسی اسلامی معاشرہ کے لئے نہ صرف یہ کہ مسئلہ نہیں بلکہ بہت سے مسائل کا حل ہے۔

ہمیں اس بنیادی نکتہ کو سمجھنا چاہیے کہ کسی بھی عملی ضرورت کو پورا کرنے اور کسی بھی جائز سرگرمی میں اور ترقی کی کادش میں اسلام آڑے نہیں آتا، اگر اس کی مقرر کردہ حدود و کالفاظ رکھ کر کام کیا جائے۔ اس بنیادی بحث کے پس منظر میں یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلامی معاشرہ میں طالبات کی تعلیم و تربیت کا نظم کس نوعیت کے کن علوم پر مشتمل ہوگا۔ اس کا مختصر جائزہ اس لئے پیش کیا جا رہا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اسلامی نظام تعلیم میں طالبات کے لئے متوازی نظام کی جو تجویز ہے اس کے امکانات عملی اور افادی پہلو سے کہاں تک ہیں اور ان کو حسب ضرورت حاصل کرنے کے لئے اسلامی ریاست کو منصوبہ بندی کرنی چاہیئے۔

۱۔ آٹھویں تک کی لازمی تعلیم اور اس کے بعد خواتین کی عمومی تعلیم کے پورے نظم کو چلانے کے لئے تربیت یافتہ خواتین کو ایک

بہت بڑی تعداد درکار ہے۔ خواتین کی اعلیٰ تعلیم اور تدریسی تربیت کے ایسے ادارے بہت بڑی تعداد میں قائم کرنا چاہئیں جہاں خدمت کرنے سے خواتین کو روزگار بھی حاصل ہو۔ یہ کالج اور جامعات کی سطح کے ایسے ادارے ہوں جن میں ان مضامین کی اعلیٰ تعلیم دی جائے۔

۲۔ خواتین کی دینی معلومات اور تربیت کیلئے بھی ایسی خواتین کی ضرورت ہوگی جو دینی علوم میں خصوصی مہارت رکھتی ہوں۔ اس مقصد کے لئے موجودہ عربی مدارس کے طرز پر لیکن نئے انداز کے طالبات کے مدارس اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہو سکتے ہیں۔

۳۔ اس کے علاوہ خواتین کو حصول معاش میں کارآمد بنانے کے لئے تعلیم و تربیت کا جو بھی نظام ہوگا اس کے لئے بھی خواتین ہی آگے آئیں گی۔ اس طرح گویا مصلیٰ کے پیشہ کا انتہائی وسیع دائرہ ان کے لئے ہوگا۔

۴۔ پورے ملک کی خواتین کو طبی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے خواتین کو ایلوپیتھک، طب

تدیم اور ہر میز پر چھک طریقہ علاج میں تربیت دی جانا چاہیے۔

۵۔ اگر محض یہ اہتمام ہو کہ خواتین کی دندان ساز خواتین ہی ہوں تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتنی بڑی تعداد میں خواتین دندان سازوں کی ضرورت معاشرہ کو ہوگی۔

۶۔ ان لائقہ تعلیمی اداروں اور ہسپتالوں وغیرہ کے لئے جو صرف خواتین کیلئے ہوں محلوں عملہ درکار ہوتا ہے وہ بھی خواتین ہی پر مشتمل ہونا چاہیے اور اس کی خصوصی تربیت کے ادارے ہونا چاہئیں۔

۷۔ بنکاری، دوکانداری، پولیس سرس، صحافت جہاں بھی یہ اہتمام کیا جاسکے کہ خواتین کا معاملہ خواتین سے ہنڈی بہتر ہے اور اس لئے ان شعبوں کے لئے اور اس طرح کے دیگر شعبوں کے لئے بھی جن میں عملی ضرورت کے تحت اضافہ ہی ہوگا، خواتین عملہ کی تربیت کے انتظامات ہونے چاہئیں۔

۸۔ دستکاری کی نوع بنوع صنعتیں خواتین کا خصوصی میدان ہیں۔ گھریلو بنیادوں پر یہ اب بھی کام کرتی ہیں اور بالعموم ان کا عملہ خواتین ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر اس طرح کی منصوبہ بندی کی جائے کہ بہت زیادہ دور جاتے بغیر اور مردوں سے خلط ملط کے بغیر اس کا ایک نظام کام کرے تو اس کے امکانات بہت وسیع ہیں ان کی تربیت دینے کے ادارے تعلیم نسواں کے نظام کا جزو ہوں گے۔

جدید دور کی بہت سی ایسی صنعتیں ہیں جن میں چھوٹے کل پرزے تیار کرنے کے لئے الگ متعدد کارخانے کام کرتے ہیں مشرقی ولایات کے حامل بعض غیر مسلم معاشروں (مثلاً جاپان) میں یہ صورت حال بہت بڑے پیمانے پر ہے۔ اسلامی معاشرہ میں اگر ضرورت محسوس کی جائے تو اس طرح کے کارخانے قائم کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن خواتین کے لئے اس ضمانت کے ساتھ کہ ان کا استحصال نہیں کیا جائے گا اور مردوں سے اختلاط کے مواقع موجود نہ ہوں گے۔

۱۰۔ علمی و تحقیقی سرگرمیوں میں خواتین کو بھی مواقع حاصل ہونا چاہئیں لیکن اگر ترجمہ کے میدان میں ان کی خدمات سے خصوصی فائدہ اٹھایا جائے تو اس کے لامتناہی امکانات ہیں۔ خواتین کی اعلیٰ تعلیم میں انگریزی عربی اور بعض دوسری زبانوں میں مہارت پیدا کرنے کا اہتمام ہوا اور سچلر یا ماسٹر کی سطح پر ترجمہ کی تربیت دی جائے۔ کسی متعین حصہ کا ترجمہ ان کی نصابی ضرورت بنایا جائے۔ اس طرح ایسی خواتین تیار ہوجائیں گی جو معیاری ترجمہ کر سکیں اور یہ ایسا کام ہے جو گھر بیٹھ کر بھی کیا جاسکتا ہے۔

اور ان کی معاش میں بھی مددگار ہو سکتا ہے۔

۱۱۔ متعدد ایسے کام ہو سکتے ہیں جو ایک خاص تربیت حاصل کر کے گھر بیٹھ کر کیے جائیں۔ اور معاوضہ بھی لیا جائے۔ اس کی ایک مثال اردو طباعت میں کتابت کا ردان ہے جس میں چند گھنٹوں کی محنت سے اچھا معاوضہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی تربیت کے خواتین کے ادارے، خواتین کے تعلیمی اداروں کا حصہ ہو سکتے ہیں۔

خواتین کی تعلیم و تربیت کے دائرہ کی وسعت کا جائزہ اس لئے پیش کیا گیا تاکہ ان کے لئے علیحدہ اداروں کے نظام اور اس کے لئے خصوصی نصابیات کی تشکیل کا ناگزیر یہ ہونا واضح کیا جائے۔ کسی ایسے معاشرہ کا تصور جہاں خواتین گھروں سے باہر قدم نہ رکھیں اور اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ ہی نہ لیں، نہ ممکن ہے اور نہ اسلامی ہے۔ اسلامی معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کا مکمل انتظام کرے۔ بلاشبہ کفالت کی ذمہ داری مرد کی ہے لیکن عورت کے لئے تعاون کرنا حرام نہیں کیا گیا۔ اس لئے اگر خواتین کی ضرورت بھی ہو، وہ آمادہ بھی ہوں اور قومی منصوبہ بندی کا تقاضا بھی ہو تو اسلامی معاشرہ کو درج بالا خطوط کی روشنی میں ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک ہمہ گیر انتظام میں ان کو معاشی سرگرمی کے لئے تیار کرنا بھی شامل کرنا چاہیے اور اس کے لئے سوچ بچار کر کے مناسب تعلیمی منصوبہ بندی کرنا چاہیے اور ان کے روزگار کے لئے ایسا انتظام کرنا چاہیے جہاں وہ حدود اسلامی کے اندر یہ حاصل کر سکیں۔ اسلامی معاشرہ مجبوری مساوات کا قائل نہیں (جو صرف خواتین کو بے وقوف بنانے کا نظریہ ہے) اس لئے وہ ان کی شرائط کار اور اوقات کار میں ان کے لئے خصوصی رعایتوں کا لحاظ بھی رکھے گا (اور مساوی حقوق کے تحت ان کی خصوصی چیزوں کو ختم کرنے کے درپے نہ ہوگا) اور ان کا استحصال بھی نہ کرے گا اور ان کی عزت و عفت کا ضامن بھی ہوگا۔ اسی لئے یہ نظام نہ صرف مسلمان خواتین کے لئے بلکہ تمام خواتین کے لئے کشش رکھتا ہے۔ پریشانی صرف ان خواتین کو لاحق ہوتی ہے۔ جو اپنی نظرت مسخ کر کے نقالی کرتی ہیں اور مساوات کے تصور میں مگن مخلوط روزگار کو چند روزہ زندگی گزارنے کا پر لطف ذریعہ سمجھتی ہیں۔ معاشی ماہرین اور قومی رہنما بھی اس نظام پر غور کریں تو عموماً کریں گے کہ جس ترقی کی خاطر وہ خواتین کو شانہ بشانہ لانے کے لئے بے چین ہیں، اگر وہ واقعی ترقی کے لئے مخلص ہیں اور دراصل ایک ہی جگہ شانہ بشانہ بلکہ دوہرانے کے لئے بے چین نہیں ہیں تو اس نظام

کو اختیار کرنے سے مسلم معاشرہ میں ترقی کی ایک بہرہ دہ جائے گی، مسلم خواتین بڑے پیمانے پر اس میں شریک ہوں گی۔ معاشی ماہرین کا صرف یہ فریضہ ہوگا کہ وہ ایسی منصوبہ بندی کریں کہ ترقی کی رفتار اتنی ہو کہ معاشرہ سے مردوں کی بے روزگاری کا خاتمہ ہو اور ان میلانوں میں سے جہاں خواتین علیٰ درجہ کر بھی معاشی سرگرمی میں مددگار ہو سکتی ہیں خواتین کو روزگار فراہم ہو۔

مخلوط تعلیم

تعلیم نسواں کے عنوان کے تحت مخلوط طریقہ تعلیم کا ایک جائزہ بھی ناگزیر ہے جو مغربی نقطہ نظر سے سابق خواتین کا طریقہ تعلیم ہے۔

۱۔ مخلوط تعلیم عورت میں جس شخصیت، صلاحیت اور ذہنیت کو تشکیل کرتی ہے وہ مخصوص شرائط ادا کرنے کی تربیت نہیں بلکہ ہر میدان میں مردوں سے مابقت، برابری اور مردوں کے دائرہ کار ہی میں اپنی صلاحیتوں کا جوہر دکھانے کی ذہنیت ہے اور اس تعلیم کے نتیجے میں مجموعی طور پر عورت مرد بن کر کچھ کرنے میں توانا کام رہتی ہی ہے مگر اپنے مدارجیات سے بھی ٹوٹ جاتی ہے نتیجتاً خاندانی نظام کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ مسلم دنیا میں مخلوط تعلیم کے تائین کو یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انلاطون نے مخلوط تعلیم کی حمایت و تائید کرتے وقت ایسی سوسائٹی کا نقشہ پیش کیا تھا جہاں خاندانی نظام کا سرے سے وجود ہی نہ ہو، اب اس کے نتیجے میں مغرب تو اس کے عین مطابق خاندان سے ہاتھ دھو رہا ہے لیکن اسلامی معاشرہ میں خاندانی نظام کی اکائی کو تحلیل کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے

۲۔ نساب اور ماحول کو مخلوط بنانے کے نتیجے میں اخلاقی بگاڑ نے نہ صرف مغرب کے معاشرتی نظام کو کھوکھلا کر دیا ہے بلکہ اس اختلاط نے مسلم ممالک میں بھی اخلاقی گراؤ کے اضافے، اساتذہ کے عزت و احترام میں کمی، دینی اقدار کی تضحیک اور ثقافتی اقدار کے مٹانے کی رفتار میں اضافہ کر دیا ہے۔

۳۔ افادی اور مادی نقطہ نظر سے بھی مخلوط تعلیم نے فوائد بخشنے کے بجائے نقصانات کا تناسب بڑھایا ہے۔ آج ہماری تعلیمی دنیا کے معیار تعلیم میں گراؤٹ، تحقیقی معیار کے گھٹنے، ہر دو اصناف کے اختلاط، تعلیم میں کمی اور ذہنی یکسوئی کے بجائے ذہنی انتشار میں اصناف کا باعث بھی مخلوط تعلیم ہے۔

۴۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں پر جو قومی دولت خرچ ہو رہی ہے اس کا نصف طالبات پر خرچ ہوتا ہے لیکن میدان کار کے بے میل جوڑ ہونے کی وجہ سے ایسی خواتین کی بہت بڑی تعداد اعلیٰ میدان میں پیشہ ورانہ خدمات انجام دینے سے قاصر رہتی ہے۔ نتیجتاً وہ نظام تعلیم جو بنیادی طور پر طلبہ کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر چلایا جا رہا ہے اس تعلیمی ڈھانچے سے نارغ شدہ خواتین کا تعلیم حاصل کرنا فنی لحاظ سے غیر افادی بن جاتا ہے جبکہ یہ رقم طالبات کی تعلیم پر اس طرح خرچ ہونی چاہیے کہ وہ ایک جانب فنی طور پر اور دوسری جانب خواتین کی مادی ضرورت میں مدد و معاون بن سکے۔

۵۔ جن تعلیمی اداروں میں بنظاہر طالبات، طلبہ کے شانہ بشانہ تعلیم حاصل کرتی دکھائی دیتی ہیں وہاں عملاً سورت یہ ہوتی ہے کہ طالبات کی حیثیت نفسیاتی اعتبار سے ثانوی ٹھہرتی ہے اور وہ احساس کمتری کا شکار ہوتی ہیں۔ یہ نفسیاتی گھٹن ان کی شخصیت کو متاثر کرنے اور بناوٹ کو اختیار کرنے کا باعث بنتی ہے جس سے ان کے مجموعی نسوانی کیرئیر پر زبرد پڑتی ہے۔

۶۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی طرز فکر کے تہذیبی اثرات کا یہ نتیجہ ہے کہ لاکھ خرابیوں کے باوجود مسلم حائے نے مجموعی طور پر مخلوط تصور کرنے کو قبول نہیں کیا ہے اور مخلوط تعلیم کی رکاوٹ کے نتیجے میں بجا طور پر مسلم دنیا میں خواتین کی ایک بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم سے محروم ہے جو کہ عظیم فتنہ خاںہ ہے۔

یہ ساری باتیں اس امر پر دلیل ہیں کہ اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل جدید کے وقت خواتین کے میدان کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے پرائمری سے اعلیٰ درجے کی تعلیم تک خواتین کے لئے

الگ تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں، دین اسلام کے تصور معاشرت کی روشنی میں ان کی فطری اور انفرادی ضروریات کے مطابق نصاب تدوین کیا جائے اور ڈسپلن قائم کیا جائے تاکہ میدان تعلیم میں حسن توازن کے ساتھ علم اور فرائض علم مسلم معاشرے کو اپنے برگد بار سے مستفید کر سکیں۔

۳۔ اقامت گاہیں

اسلامی تصور تعلیم میں تعلیم دراصل وسیع مفہوم میں تربیت ہے۔ موجودہ نظام تعلیم کی کس خامیاں تربیت کو تعلیم کا جزو قرار نہ دینے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسلامی نظام میں تعلیم و تربیت دونوں کو ہی اہمیت دی جائے گی۔ نظام تعلیم کا جو خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

نظام تعلیم کا ایک جزو طلبہ کی اقامت گاہیں ہیں۔ بعض تعلیمی ادارے سو فیصد اقامتی ہو سکتے ہیں۔ بعض کے ساتھ غیر اقامتی (DAY SCHOLARS) بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اور بعض محض اقامت گاہیں ہو سکتی ہیں جہاں مختلف اداروں میں پڑھنے والے طلبہ یا طالبات رہائش پذیر ہوں۔ یہ تعلیم گاہ کا حصہ ہیں اور ان کے انتظام میں اساتذہ کی شرکت ہوتی ہے۔ یہاں اساتذہ اور طلبہ کو زیادہ شخصی بنیادوں پر قریب آنے کا موقع ملتا ہے اور طلبہ اپنے اساتذہ کا اثر زیادہ اچھی طرح قبول کرتے ہیں۔ اساتذہ کی مربیانہ حیثیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ دوسری طرف یہ اقامت گاہیں طلبہ کے لئے خود استقامی کی ایسی تجربہ گاہ ہیں ثابت ہوتی ہیں جہاں کی کارکردگی مستقبل کی ساری زندگی میں ان کے کام آتی ہے۔ اقامت گاہوں کا اپنا مکمل نظام ہوتا ہے۔ قواعد و ضوابط ہوتے ہیں نظام الادقات ہوتا ہے۔ معمولات ہوتے ہیں، روایات ہوتی ہیں، مل جل کر رہنے سے پیدا ہونے والے مسائل و معاملات ہوتے ہیں۔ یہاں کا نظم سخت یا نرم ہو سکتا ہے۔ غرض جو کچھ بھی ہو، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں چند سال گزارنے والا طالب علم یہاں کی چھاپ لے کر نکلتا ہے۔ اس کے کردار پر، رہن سہن پر، بول چال پر اور پسند و ناپسند پر اس کے اثرات واضح اؤ نمایاں ہوتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک ایسے نظام کے لئے جو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو بھی

اہمیت دیتا ہو یہ ضروری قرار دیا جائے گا کہ زیر تعلیم طلبہ و طالبات کے لئے اقامت گاہوں کا مکمل انتظام ہو۔ لیکن بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ اقامت گاہوں کے محاسن کے ساتھ مفاسد بھی ہیں۔ دوسرے یہ کہ طلبہ کو گھر کے ماحول سے جدا کر لینے کے بھی اپنے اثرات و نتائج ہوتے ہیں۔ بنسلسلہ شاید اس بنیاد پر ہونا چاہیے کہ زیارہ اچھی تربیت اقامت گاہوں میں میسر ہے یا گھروں میں۔ برے گھر سے اچھے ہوٹل اچھے ہیں۔ اور برے ہوٹلوں سے اچھے گھر اچھے ہیں۔

ایک نظریاتی ریاست کے لئے جو نئی نسل کو نظریہ کا علمبردار بنا کر خاص قالب میں ڈھالنا چاہتی ہو اور معاشرہ میں انقلاب برپا کر دینا چاہتی ہو مؤثر اور نتیجہ خیز حکمت عملی یہی ہونی چاہیے کہ بڑے پیمانے پر اقامت گاہوں کا نظام قائم کرے اور اس نظام کو خاص انداز پر چلانے کا خصوصی اہتمام کرے تاکہ نتائج حسبِ منشا ملیں۔ اگر کارپر دازوں کو یہ احساس بھی ہو کہ گھروں میں جو نقش طلبہ کے کردار پر ڈالے جا رہے ہیں وہ ریاست کی منشا کے خلاف ہیں تو یہ اہتمام ریاست کے لئے نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کے نظریاتی پہلو کے علاوہ اس مسئلہ کا ایک عملی پہلو بھی ہے۔ ہر ملک میں آب و ہوا کے پھیلاؤ کا اپنا انداز ہو گا۔ ضرورت اور رجحان کے لحاظ سے مطلوبہ تعلیم و بہارت میں تنوع بھی ہو گا اور یقیناً اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں ہر قبضہ اور دیہات میں فراہم نہیں کی جاسکتیں جب کہ اعلیٰ تعلیم پر ان قبضات و دیہات میں رہنے والوں کا حق تعلیمی مراکز پر رہنے والوں سے کسی طرح کمتر نہیں ہے۔ اس طرح عملی نقطہ نظر سے اقامت گاہوں کا انتظام ناگزیر ہے۔

اس عملی پہلو کا ایک رخ اور بھی ہے۔ اقامت گاہوں کے مناسب انتظام کی عدم موجودگی یکساں مواقع کی فراہمی کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ اشاعتِ تعلیم میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ مزید یہ کہ اپنی پسند اور رجحان کے مطابق تعلیم کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ اس کا اثر طالبات کی تعلیم پر سب سے زیادہ پڑتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے لئے کسی دوسرے مقام پر اگر باقاعدہ اقامت گاہ نہ ہو تو کسی اور طرح بلکہ حاصل کر کے رہنا جیسا کہ طلبہ کر لیتے ہیں ممکن نہیں ہوتا۔

ان نکات کی روشنی میں ہمیں یہ متعین کرنا چاہیے کہ اسلامی نظامِ تعلیم میں اقامت گاہوں کا کیا مقام ہو اور اس بارے میں اس کی پالیسی کیا ہو۔

اسلام کے تصورِ تعلیم میں تربیت کے مؤثر عامل کی حیثیت سے اقامت گاہوں کو غیر معمولی اہمیت

دی جائے گی اور ان کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ اگر اسلام کی تعلیمی روایت کو دیکھا جائے تو صفحہ کا پہلا مدرسہ اقامتی ہی تھا۔ بعد کے دور میں بلکہ آج تک دینی مدارس اقامتی ہوئے ہیں اور اس لئے جیسا کچھ بھی وہ اپنے طالب علم کو بنانا چاہتے ہیں بنانے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں تعلیمی تاریخ میں ملتی ہیں کہ طلبہ نے شوق علم کی خاطر دورِ راز کے سفر کئے اور اساتذہ کے پاس جا کر ان کے مدارس میں رہے۔ ان اقامتی مدارس کے اخراجات فراہم کرنا کبھی مسلم معاشرہ کے لئے مسئلہ نہ رہا۔ اسی پس منظر میں موجودہ دور کی اسلامی ریاست کو اقامت گاہوں کا ایک جال پورے ملک میں پھیلانا چاہیے اور اس کے لئے وسائل فراہم کرنا چاہیئے۔ وسائل کا ایک بہت بڑا ذریعہ اوقات ہو سکتے ہیں۔ ان اقامت گاہوں کی مدد سے مقامی تعلیم کا حصول زیادہ سہل ہو جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مکمل طور پر نظام تعلیم اقامتی ہو گا۔ نہ صرف وسائل کی بنا پر ایسا ممکن نہیں بلکہ فطری طور پر بڑے پیمانے پر اقامتی نظام سے خاندانی نظام اور گھروں کے معاملات بھی متاثر ہوں گے۔ اس لئے اس بارے میں ایک معقول اور فطری پالیسی اختیار کی جائے۔ جہاں جہاں ضرورت ہو وہاں اقامت گاہیں لازماً فراہم کی جائیں۔ یہ انتظام مجبوراً نہ ہو بلکہ ایک مثبت کام سمجھ کر کیا جائے۔ ان کے قیام میں یہ امور پیش نظر ہونے چاہئیں :

۱۔ ان اقامت گاہوں کو ان کے حال پر نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ ایک متعین پالیسی کے تحت ان کے لئے نظام کار بنایا جائے اور محکمہ تعلیم ان کی صحیح کارکردگی کے لئے اور موثر نگرانی کے لئے رہنما خطوط بھی دے اور نظم بھی قائم کرے۔ انہیں نظام تعلیم کا جزو قرار دے کر ان کے لئے ہم آہنگ پالیسی وضع کی جائے۔

۲۔ ملک بھر کی طالبات کو عمومی تعلیم (میٹرک کی سطح تک) کی سہولت اس طرح فراہم کی جائے کہ وہ گھروں سے مناسب فاصلے پر تعلیمی اداروں میں روزانہ آجائیں اور اقامت گاہوں کی ضرورت پیش نہ آئے۔ طالبات کے مدارس کو ترجیحی بنیادوں پر ٹرانسپورٹ فراہم کی جائے تاکہ طالبات آمد و رفت کی تکالیف سے بچ کر تعلیم حاصل کر سکیں۔

۳۔ طلبہ و طالبات کے لئے علیحدہ اقامت گاہیں ہوں۔

۴۔ آبادی اور فاصلوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی مناسب انتظامی یونٹ کو بنیاد بنا کر تعلیمی اداروں کے ساتھ یا علیحدہ اقامت گاہوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔

راہنما خطوط اور نقشہ کار

یہ ہماری بحث کا اہم ترین حصہ ہے۔ اقامت گاہوں کا قیام بذات مقصد نہیں ہے اور نہ محض لوگوں کے مطالبات پورے کرنے کے لئے ہے، بلکہ مثبت طور پر اس لئے ہے کہ تعلیم و تربیت کا جو عمل پیش نظر ہے، اسے موثر بنایا جائے۔ اس لحاظ سے اقامت گاہیں دراصل اسلامی تربیتی ادارہ ہیں اور وہاں رہنے والے طالب علم اسلامی سیرت و کردار کے گہرے نقوش لے کر میدان زندگی میں دھل ہوگا۔

یہ ایک وسیع موضوع ہے، اس کا احاطہ کرنا پیش نظر نہیں ہے بلکہ چند اشارات پیش کرنا ہیں تاکہ خاکہ مکمل ہو سکے۔

۱۔ اقامت گاہوں کی تعمیر میں یہ خیال رکھا جائے کہ اسلامی طرز رہائش کے تقاضے پورے ہوں۔ آداب طہارت کا خیال رکھا جائے، سہولت سے وصول کیا جاسکے۔ نماز ادا کرنے کے لئے مناسب مسجد موجود ہو جو ادائیگی نماز کے علاوہ اقامت گاہ کی دیگر اجتماعی سرگرمیوں کا مرکز بھی ہو۔

۲۔ طرز رہائش اوسط اور سادہ ہو اور اس کا خیال رکھا جائے کہ سب طلبہ عموماً ایک معیار سے رہیں۔ چند طلبہ کو اپنی امارت کی نمائش کے مواقع بھی نہ ملیں اور ان کی یہ تربیت بھی کی جائے کہ وہ یہ مواقع تلاش بھی نہ کریں۔

۳۔ ان کی نگرانی اور انتظام کو محض ضمنی حیثیت نہ دی جائے بلکہ اس کے لئے اہل افراد کو منتخب کیا جائے جو اچھے کردار کے ساتھ ساتھ اتنا علم، تجربہ اور شوق رکھتے ہوں کہ طلبہ کی اسلامی خطوط پر تربیت کا فریضہ انجام دے سکیں۔

۴۔ اقامت گاہ کے معمولات، طلبہ کے سونے جاگنے کے اوقات، اور دیگر معاملات اسلامی تصور کے مطابق مرتب کئے جائیں۔

۵۔ شخصیت کی نشوونما کو پیش نظر رکھا جائے، عمر کے لحاظ سے کھیل صحت مند تفریح اور دیگر اجتماعی مشاغل کے مواقع فراہم کئے جائیں۔

۶۔ طلبہ کی مناسب تربیت کے لئے تمام معاملات خود ان کے ہی سپرد کئے جائیں تاکہ وہ ذمہ داری سے کام کرنا سیکھیں۔

۷۔ طلبہ میں مطالعہ کی عادت ڈالی جائے اور درسی کتب کے علاوہ قرآن، حدیث

سیرت، اسلامی نظریہ اور احوال دینا معلوم کرنے کے لئے رسائل و کتب کو بھی مطالعہ میں رکھا جائے۔

۸۔ طلبہ میں محنت اور جفاکشی کی عادت ڈالی جائے۔ عملی کاموں میں شرکت کا موقع دیا جائے۔

۹۔ کھیل اقامت گاہوں کی سرگرمیوں کا لازمی حصہ ہونے میں طلبہ کو پورے مواقع دیئے جائیں اور کھیلوں کو ان کی شخصیت کی تعمیر کا ذریعہ بنایا جائے۔

۴۔ سہولتوں کی فراہمی

تعلیم کے عمل کو مکمل کرنے کے لئے استاد، طالب علم اور کتاب کے ساتھ ساتھ تعلیمی ادارہ اور اس کے ساتھ جن سہولتوں کا تصور درایت ہے ان کی فراہمی ہے۔ بلاشبہ درخت کے نیچے بیٹھ کر بھی تعلیم دی گئی ہے اور دی جاسکتی ہے اور چٹائیوں پر بیٹھ کر تعلیم دی جاتی رہی ہے اور آج بھی دی جاتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ بذاتِ خود کوئی مطلوب قدر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سہولتوں میں کمی، حصولِ تعلیم کے جذبہ میں رکاوٹ نہ بننا چاہیئے لیکن ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ وہ شہریوں کو تعلیم کے لئے مناسب سہولتیں فراہم کرے۔ سہولتوں میں سب سے پہلے تعلیمی ادارہ کی عمارت ہے۔ پرائمری اسکول ہو یا جامعہ، عمارت کے بغیر ہم آج کے درمیں تعلیم کا تصور نہیں کر سکتے۔ یہ عمارت ضرورت کے لحاظ سے جھوٹی یا بڑی ہو سکتی ہے۔ پتھر کا بھی ہو سکتی ہے لیکن بنیادی طور پر اسے سادہ ہونا چاہیئے، زیب و زینت و آرائش پر روم خرچ نہ ہونا چاہیئے۔ انہیں دراصل اپنے کام کے لئے مناسب ترین ہونا چاہیئے۔ ایک پرائمری اسکول جھونپڑی میں ہو اور اسی معاشرہ کے کچھ دوسرے افراد کے لئے ایئر کنڈیشنڈ عمارت میں اسکول ہو تو یہ اسلامی نظامِ تعلیم نہیں ہے۔ اسلامی ریاست کو چاہیئے کہ ایک ہدف مقرر کر کے تمام تعلیمی اداروں کے لئے مناسب عمارتیں فراہم کرے۔ اس کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ طالبات کے اداروں میں چار دیواری کا مناسب انتظام لازمی ہے۔

دوسری سہولت فریجی کی ہے۔ اگر کسی معاشرہ میں کرسی پر بیٹھنا باعثِ عزت ہو اور یہ غیر اسلامی بھی نہ ہو۔
تو طلبہ کو بیٹھنے کے لئے بیج یا کرسی کا فراہم کیا جانا تعلیم کے عمل کا ایک جزو ہے کہ اس طرح طالب علم کی نظر میں
علم کی قدر و منزلت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایک طالب علم کے لئے گریب تو کرسی فراہم ہے لیکن اسکول میں
میں جا کر اسے میلی دری پر بیٹھنا پڑے تو اس کی نظر میں علم حقیر ہو جاتا ہے۔ تمام اداروں میں اوسط معیار
کے مطابق فریجی فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ دیکھنا بھی اسی کی ذمہ داری ہے کہ ایسا نہ ہو کہ
ایک جگہ تو تالین بچا کر گدے دار کر سبیاں رکھی جائیں اور دوسری جگہ لکڑی کی بنچیں بھی دستیاب نہ ہوں۔
سہولتوں کے ضمن میں پانی اور ہوا کا انتظام، حوائج ضروریہ سے فراغت کا انتظام، کھیلنے کو دینے
کے لئے مناسب جگہ اور کھیل کے سامان کی فراہمی بھی آتا ہے لیکن بطور خاص لائبریری اور تجربہ خانے ہیں
جن کے مناسب انتظام کے بغیر صحیح معنوں میں تعلیم کے لئے بنیادی سہولت کی فراہمی بھی مکمل نہیں ہوتی۔

اسلامی نظامِ تعلیم میں لائبریری کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگی اس لئے کہ اس کے ذریعے طالب علم
کا رابطہ اپنی باہر کی دنیا سے ہوتا ہے اور اسے اہل فکر کی صحبت و نسبت ہوتی ہے۔ لائبریری کے لئے کتابوں
کا انتخاب لائبریری کا مستقل استعمال اور طلبہ میں شوق مطالعہ کی پرورش یہ سب مل کر ہی تعلیم مکمل ہوتی
ہے۔

سائنس و فنی علوم کی تفہیم کے لئے تجربہ خانے ضروری ہیں اور ان کے لئے مناسب جگہ اور ضروریات
کی فراہمی لازمی ہے۔

سہولتوں کی فراہمی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ میں ان چیزوں کے مناسب استعمال کا اور ان کی
حفاظت کرنے کا احساس بیدار کیا جائے۔ ان کو جاننا چاہیے کہ جو مذہب پانی ضائع کرنے کی بھی مذمت کرتا ہو اس
کی نظر میں جان بوجھ کر بالاپرواہی سے قیمتی اشیاء کو خراب کرنا کیسا ٹھہرے گا۔ اشیاء کا مناسب استعمال ایک
مسلمان کے فرائض کا حصہ ہے اور اس فرائض کی تکمیل میں اقامت گاہوں کے دور تربیت کو اپنا حصہ ادا کرنا
چاہیے۔

سہولتوں کے ضمن میں ان سب امور کا تذکرہ اس لئے ضروری محسوس کیا گیا کہ اگر کسی ذہن میں یہ تصور
ہے کہ اسلامی تعلیم وہی ہے جو چٹائی پر بیٹھ کر دی جائے یا اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ دور جدید کی سہولتوں سے
تعلیمی اداروں میں استفادہ نہ کرنا چاہیے۔ تو یہ تصور درست ہو جائے۔ ایک اسلامی ریاست، ان سہولتوں کی

نرابھی کو قرار واقعی اہمیت دے گی اور اس طرح تعلیم کے باب میں اپنا اسلامی فریضہ ادا کرے گی۔

۵۔ تعلیمی معیار

تعلیمی معیار سے زیر تعلیم طلبہ طالبات کا مقررہ نصاب میں مہارت و استعداد حاصل کرنا مراد لیا جاتا

ہے۔ اس کو جانچنے کے لئے امتحانات کا پورا نظام کام کرتا ہے اور درجہ بدرجہ طالب علم کو فارغ کرتا ہے تاہم فارغ التحصیل ہونے کے بعد جن اداروں میں وہ کام کرنا ہے وہ اس کا کردگی کی بنا پر اس کے تعلیمی معیار کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں۔ اگر امتحانات کا نظام کامل ہو اور اس میں تمام طالب علم مکمل کامیابی حاصل کریں تو یہ مثالی تعلیمی معیار ہوگا اور اسی میں کمی کی مناسبت سے تعلیمی معیار کو کم تر قرار دیا جانے کا خواہ اسٹی فیصد طلبہ پاس ہوں لیکن وہ بھی مطلوبہ معیار کے نہ ہوں تو یہ مسئلہ وسائل کے زیاں کا ہی نہیں بلکہ تعلیمی معیار کی کمتری اور نظام تعلیم کی ناکامی کا ہوگا۔ اسی طرح اگر مطلوبہ معیار کے صرف ۲۰٪ فیصد طلبہ پاس ہوں تو بھی یہ لمحہ نگر یہ ہوگا کہ نظام تعلیم اس سے زیادہ بڑی تعداد میں مطلوبہ تعلیمی معیار کے افراد کیوں تیار نہیں کر رہا ہے۔

اسلامی تصور کے تحت جس طرح تعلیم کا تصور دین ہے اسی طرح تعلیمی معیار کا تصور دین ہے۔ یعنی یہاں معیار کی جانچ کرتے ہوئے طالب علم کی تعلیمی استعداد ہی نہیں بلکہ اس کی سیرت و کردار کو بھی دیکھا جانا چاہیئے۔ روایتی طور پر تقاس کی اتنی اہمیت اب بھی ہے کہ ”صداقت نامہ کردار“ کے بھر ڈگری نہیں دی جانی ہے لیکن یہ محض رسمی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں کیونکہ دوران تعلیم کردار کو حقیقی اہمیت دی جائے گی اس لئے اس کا صداقت نامہ بھی حقیقت کی بنیاد پر ہونا چاہیئے اور اس کا اپنا وزن ہونا چاہیئے۔ طالب علم کے معیار کے برتر ہونے کے لئے ضروری ہو کہ وہ نہ صرف اپنے مضمون میں استعداد رکھتا ہو بلکہ اخلاق و کردار بھی اچھے رکھتا ہو۔ اگر اسلامی نظام تعلیم میں ایک طالب علم اپنے مضمون کا ماہر ہو لیکن اخلاق باختہ ہو تو یہ اس نظام کی ناکامی ہوگی اور ہم کہیں گے کہ تعلیمی معیار گر رہا ہے (یعنی تعلیمی و تربیتی معیار) تعلیمی معیار درست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ امتحانات کا نظام، یعنی معیار جانچنے کا بیجا نہ درست کام کر رہا ہو۔ اس کے لئے ایک طرف یہ ضروری ہے کہ طریقہ امتحان معیار جانچنے کے لئے مؤثر ہو اور دوسری طرف یہ ضروری ہے کہ اس نظام کو چلانے والے (اساتذہ اور منتظمین) دیانت دار اور امین ہوں۔ اس

صورت میں امتحان کے نتائج تعلیمی معیار کے زوال یا عروج کی نشاندہی کریں گے۔ کسی ادارہ کے اچھے نتائج اس ادارہ کی حد تک اس کے طلبہ کے اچھے ہونے اور برے نتائج اس ادارے کی حد تک اس کے طلبہ کے معیار کے برے ہونے کو ظاہر کریں گے۔ تعلیمی نظام کی کامیابی یہ ہے کہ بیشتر طلبہ اچھی طرح سے پاس ہوں اسلامی نظام تعلیم میں اس سے مراد یہ ہوگی کہ طلبہ اور طالبات تعلیم کے مقاصد کے لحاظ سے کامیاب ہیں۔ معنوں میں بہارت مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔

اسلامی نظام تعلیم کے کارپردازوں کو مسلسل اس کی فکر کرنا چاہیے کہ تعلیمی معیار عام رہے اور بہتر ہوں اگر پورا ڈھانچہ کھڑا کر دیا جائے 'وسائل بھی فراہم کر دیئے جائیں' کتابیں بھی مہیا ہوں، اساتذہ بھی موجود ہوں، سہولتیں بھی فراہم ہوں لیکن زیر تعلیم طلبہ کو اور قابلیت کے لحاظ سے خام ہوں تو سوچنا چاہیے کہ ناکامی کی وجہ کیا ہے اور خامی نظام کے اندر ہے تو اسے دور کرنا چاہیے صحیح معنوں میں اسلامی نظام تعلیم اسے ہی کہا جاسکے گا جہاں تعلیمی معیار بہتر ہوں اور مسلسل بہتر ہوتے جائیں۔

۶۔ جدید تحقیقات سے استفادہ

اسلامی نظام تعلیم کا ایک پہلو یہ ہے کہ کوئی بامد نظام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا مسلسل عمل ہے جس میں برابر اصلاح اور بہتری کی جاتی ہے۔ اس کے لئے نہ صرف خود اپنے تجربات سے استفادہ کیا جائے گا بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی تعلیمی تحقیقات ہو رہی ہوں ان کے نتائج کو پرکھ کر ان سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ حکمت کی ہر بات ہماری میراث ہے اور ہمیں اسے لینے میں کوئی تاثر نہیں ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک میں تعلیمی موضوعات پر تحقیق ہو رہی ہے۔ بعض بین الاقوامی ادارے بھی اس کام میں مصروف ہیں۔ ان کے موضوعات ایسے ہو سکتے ہیں جو ہم سے بھی متعلق ہوں اور جن کے نتائج ہمارے لئے مفید ہوں۔ لیکن ہمیں باہر کی کوئی بات محض اس لئے نہیں قبول کرنا ہے کہ یہ باہر سے آئی ہے بلکہ اپنے علم اور حالات کی روشنی میں پرکھ کر دیکھنا ہے کہ یہ ہمارے بنیادی تصورات سے کہاں تک مطابقت رکھتی ہے اور حالات میں کہاں تک موثر ہے۔

اسلامی نظام تعلیم میں زندگی کے دوسرے دائروں کی طرح ایک وہ حصہ ہے جو بنیادی مقاصد اس کی رون اور طریق کار کے بعض راہنما اصولوں سے متعلق ہے اور دوسرا وہ حصہ ہے جو تفصیلات و جزئیات اور

زمانے و حالات کے لحاظ سے تقاضوں کی تکمیل سے متعلق ہے۔ ان دونوں کے ہم آہنگ مجموعہ کا نام ہی اسلامی نظام تعلیم ہے۔ کسی بھی ملک میں اس نظام کو عملاً نافذ کرنے کے لئے بہت تحقیق کی ضرورت ہوگی۔ یہ تحقیق تنگ نظری یا محدود ذہنیت پر مبنی نہ ہو بلکہ خورشریعت نے جو آزادی دی ہے اور کسی نظام کو ہر دور میں قابل عمل بنانے کے لئے یہ آزادی لازمی و فطری ہے۔ اس سے پورا استفادہ کرنے ہوتے ہو۔ اس سے ہمیں وہ راہنمائی ملے گی جس کی روشنی میں ہم دوسرے ملکوں کی تجربات سے چھان چھانک کر ناٹھائیاں کریں گے۔ اگر تحقیق کے بعض طریقے دنیا میں استعمال ہو رہے ہیں اور وہ فی نفسہ غیر اسلامی نہیں ہیں تو انہیں استعمال کرنے اور اپنے ملک کے حالات میں ان کا اطلاق کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیئے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی ریاست میں نظام تعلیم کے عملی تجربہ کے ساتھ ساتھ تعلیمی تحقیق کا عمل جاری رہے گا۔ یہ بیان کرنا اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ اسلامی نظام تعلیم کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ کسی پرانے نظام تعلیم کو ہو ہو اٹھا کر نافذ کر دیا جائے گا۔ اسلامی نظام تعلیم تو دور حاضر کی کسی اسلامی ریاست کی تمام تعلیمی ضروریات اور چیلنجز کا شریعت اسلامی کی روشنی میں جواب کی حیثیت رکھے گا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تحقیق و مطالعہ کا ایک زندہ نظام مسلسل برسرکار رہے جو حقیقی پیش آمدہ مسائل سے بحث کرے اور حل معلوم کرنے کے لئے نہ صرف خود جدید ترین طریقے استعمال کرے بلکہ دوسرے ملکوں میں جو کچھ کیا جا رہا ہو ان سے بھی استفادہ کرے۔

1- Dr. Anis Ahmed "Muslim Women and Higher Education" Institute of Policy Studies, Islamabad.

۲۔ احمد انس "مخلوط تعلیم" ادارہ مطبوعات طلبہ، لاہور "جداگانہ نظام تعلیم" اسلامی جمیعت طالبات پاکستان۔ مجلہ تعلیم: ۱۱، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد۔

حکمت عملی



مقالہ میں اسلامی ریاست نظام تعلیم کا تصور آئی تاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس خاکہ میں رنگ بھرنا اور اس کے مطابق کسی ملک کے رائج نظام تعلیم کو اسلامی قالب میں ڈھالنا ایک عملی مسئلہ ہے۔ اس کے لئے حکمت عملی ہر ملک کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہے اور ہونا چاہیے۔ لیکن ایک ملک کی نظیر اور تجربہ سے دوسروں کو مدد مل سکتی ہے۔ مقالہ نگار نے پاکستان کے مخصوص حالات میں اس حکمت عملی کے بنیادی نکات متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مخصوص حالات یہ ہیں کہ حکومت کی اعلان شدہ پالیسی ہے کہ ملک کے نظام تعلیم کو اسلامی قالب میں ڈھالا جائے، اس کے لئے تدابیر بھی اختیار کی جارہی ہیں جو نتیجہ خیز ہوتی نظر نہیں آ رہی ہیں، حکومت کی اپنی مشینری میں اور معاشرہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ان تدابیر کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دینا چاہتے۔ حکومت کی مشینری اور معاشرہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو نظام تعلیم کو اسلامی بنانے میں مخلص ہیں لیکن کوشش میں کمی یا حالات یا دونوں کی وجہ سے ان کی مساعی بھی نتیجہ خیز نہیں ہوتیں۔ اس صورت حال میں کیا حکمت عملی اختیار کی جائے؟ حکمت عملی کی تجاویز کے دو حصے کئے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں ان اسلامی قوتوں کے لئے لائحہ عمل ہے جو نظام تعلیم کو اسلامی بنانا چاہتی ہیں اور دوسرے میں حکومت کے لئے لائحہ عمل ہے کہ اگر وہ اپنے اعلانات میں مخلص ہے تو کیا کرے۔

(۱)

- ۱۔ صوبے اور مرکز کی وزارت تعلیم اور تعلیم سے متعلق دوسرے تمام موثر اداروں میں اسلامی نظام تعلیم کے قیام میں مخلص افراد کا باہمی مسلسل گہرا رابطہ قائم کیا جائے تاکہ وہ اپنے اپنے منصبی فرائض اس طور پر ادا کر سکیں کہ ان کی کوششیں حصول

مقصد میں کارگر ہو سکیں۔

۲۔ اساتذہ و طلبہ اور معاشرہ کی دیگر قوتوں کی طرف سے نظامِ تعلیم کو اسلامیانے کے لئے موثر اور طاقتور آواز اٹھائی جاتی ہے۔ غیر اسلامی منظر پر احتجاج ہوا نہیں بغیر نوٹس لئے نہ جانے دیا جائے۔ متعینہ تعداد میں کم قابل عمل اور تاثیر کے لحاظ سے دوسرے مثبت تجاویز کے لئے فضا ہموار کی جائے، مطالبے کئے جائیں اور انہیں تسلیم کر دیا جائے۔

۳۔ تعلیم سے متعلق تمام میدانوں میں مطالعے اور تحقیق کا انتظام ہو تاکہ عام بیداری پیدا ہو نیز سرکاری اداروں کی موثر راہنمائی ہو سکے۔

۴۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع سے

(۱) نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیل

(۲) معیارِ تعلیم کی بہتری

(۳) یکساں مواقع کی فراہمی

(۴) طلبہ اور اساتذہ کے مسائل پر اسلامی و عملی نقطہ نظر سے ابلاغ کا فریضہ

انجام دیا جائے۔

۵۔ تعلیم کے دائرہ میں موجود اسلام دشمن عناصر کا ہتھکنڈا لگایا جائے اور ان کی نگرانی کی جائے اور انہیں بے اثر بنانے کے لئے تدابیر اختیار کی جائیں۔

۶۔ تعلیمی مشینری اور اداروں کے عملہ میں ایسے افراد کو آگے لایا جائے جو اسلامی نظامِ تعلیم کے قیام میں موثر حصہ ادا کر سکتے ہوں۔

۷۔ مختلف مراحل کے لئے ایسی درسی کتب تیار کی جائیں جو اسلامی تفصیلات کی حامل ہوں اور نمونہ کے طور پر پیش کی جاسکیں اور سرکاری ادارے انہیں استعمال کر سکیں۔

۸۔ اساتذہ کی پورے ملک میں بھیلی ہوئی اتنی بڑی تعداد کو متحرک اور انہیں تعلیم و تربیت میں اپنا حقیقی حصہ ادا کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے تدابیر اختیار کی جائیں۔

۹۔ اساتذہ کے تدریسی اداروں پر خصوصی توجہ دی جائے۔

۱۰۔ نجی دائرہ میں ایسے تعلیمی ادارے کھولے جائیں جو حتی الامکان اسلامی نظام تعلیم کا نمونہ ہوں۔

۱۱۔ حکومت کی جانب سے جو اعلانات و اقدامات اسلامی ٹیکسل کی سمت میں کئے جائیں ان میں بھرپور تعاون کیا جائے (مثلاً نماز باجماعت کا انتظام)

کسی ملک میں اسلامی نظام تعلیم کے حامی افراد کے لئے اس لائحہ عمل پر عمل کئے بغیر وہ مرحلہ نہیں آسکتا کہ اسلامی نظام تعلیم عملاً قائم ہو جائے۔ کسی حکومت کو بھی اگر یہ نظام نافذ کرنا ہوگا تو اسے ڈھلے ڈھلائے افراد ہی نہ ہوں گے۔ افراد اس عمل کے دوران ہی تیار ہوں گے۔ اس لئے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ محض خواہش کرنے سے اسلامی نظام تعلیم نافذ ہو جائے گا تو یہ خیال خام ہے۔ جب تک کچھ لوگ اس کے لئے جدوجہد کریں گے، مسلسل کوشش میں مصروف نہ رہیں گے، منزل کیسے حاصل ہوگی۔؟

(۲)
۱۔ حکومت کے لئے یہ اصول رہنا ہوں۔
اسلامی نظام تعلیم کو محض نظریے کے نفوذ کا مسئلہ نہ قرار دیا جائے بلکہ

الف۔ تمام طبقات کے لئے عدل کی بنیاد پر یکساں تعلیمی مواقع کی فراہمی
ب۔ تعلیمی اداروں کو مناسب سہولتوں کی فراہمی

ج۔ تعلیمی معیار کی بہتری

د۔ روزگار کی فراہمی

۵۔ ملکی ضروریات کی توجہ بھی اسلامی نظام تعلیم کا مسئلہ قرار دیا جائے اور ان امور کے لئے منصوبہ بندی کی جائے۔

۲۔ تعلیم کی غیر معمولی اہمیت کا اظہار اس کے لئے فراہم کردہ وسائل سے ہونا چاہیئے۔ یہ دفاع سے کم اہم نہیں۔ اس کے لئے بے دریغ وسائل فراہم کئے جائیں۔ گاؤں گاؤں تعلیم کا چرچا ہو۔ ہر شہری تعلیم یافتہ ہو جائے۔ تعلیمی ادارے مثالی ہوں، پیشہ سدریس باعث عزت و تبحر ہو۔ تعلیمی ترقی کے کسی جائز منصوبہ کے لئے وسائل کی کمی اڑے آنا، اسلامی نظام تعلیم کے مقاصد کو ناکام کرنے کے مترادف سمجھا جانا چاہیئے۔

۳۔ فراہم کردہ وسائل کے دیندارانہ خرچ کو یقینی بنایا جائے۔

۴۔ یہ بات محسوس ہونا چاہیئے کہ حکومت کے احکام نافذ ہونے کے لئے جاری ہوتے ہیں جو پہلو تہی کرے گا۔ اس کے لئے احتساب سے بچنے کی کوئی سبیل نہ ہوگی۔ یہ نہایت اہم نکتہ ہے۔ حکمت عملی کی کامیابی اس پر منحصر ہے۔

۵۔ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے سہ سالہ منصوبہ بنا کر عمل کیا جائے جس کے بنیادی نکات یہ ہوں:

- ۱۔ نصابات کی تدوین نو اور درسی کتب کی تیاری کو اولین اہمیت دی جائے۔
- ۲۔ پرائمری اسکولوں کا اس طرح جال پھیلایا جائے کہ ہر شخص کو آنکھوں سے نظر آجائے۔ مناسب عمارت اور فرنیچر فراہم ہو۔ پرائمری تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔
- ۳۔ تعلیم بالناں کے ذریعے خواندگی عام کی جائے۔ اس کے لئے ایسا نصاب استعمال کیا جائے جو محض پڑھنا نہ سکھائے ایک اچھا مسلمان شہری بنائے۔ دیہی آبادی کیلئے اور مل کے مزدوروں کے لئے خصوصی منصوبے بنائے جائیں۔ خواتین کے لئے پورا علیحدہ نظام ہو تاکہ ان میں اسلامی نقطہ نظر سے ان کے حقوق کا شعور بیدار کیا جائے۔

۴۔ افرادی طاقت کی محسوس منصوبہ بندی کی بنیاد پر فنی تعلیمی ادارے بڑی تعداد میں کھولے جائیں۔

۵۔ اساتذہ کے تربیتی اداروں کو مرکزی اہمیت دی جائے۔ نہ صرف اسکول بلکہ کالج اور جامعات کے اساتذہ کو بھی تقرری کے بعد کام شروع کرنے سے پہلے تربیتی کورس سے گزارا جائے۔ اس کے لئے خصوصی نصابات اور نظام العمل تیار کیا جائے۔

۶۔ دینی مدارس کے علاوہ جدید تعلیمی اداروں کو ایک جیسا کر دیا جائے۔ تعلیمی اداروں میں داخلہ محض قابلیت کی بنا پر دیا جائے۔

۷۔ ابتدائی طور پر دینی مدارس کے نصابات میں بنیادی اصلاحات کی جائیں۔ جدید

اداروں میں مجوزہ اصلاحات کے بعد کسی اگلے مرحلہ پر دونوں کو ایک نظام کے تحت لانے پر غور کیا جائے۔

۸۔ قومی زبان کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کیا جائے۔

۹۔ خواتین کے لئے تعلیمی ادارے اعلیٰ سطح تک قائم کئے جائیں۔

۱۰۔ تعلیم سے متعلق تمام سرکاری اداروں کا جائزہ لے کر فرائض کا تعین کیا جائے تاکہ تکرار

میں وسائل کا زیاں نہ ہو۔ پھر مسلسل جائزہ کا نظام رکھا جائے۔

۱۱۔ اساتذہ کی فلاح و بہبود کو حکمت عملی کا اہم نکتہ تصور کیا جائے۔

اور آخری نکتہ یہ ہے کہ اس حکمت عملی کو بروئے عمل لانے کے لئے حکومت کو روایتی سرکاری مشینری

کے ساتھ قوم کا تعاون حاصل کرنے کی مثبت تدابیر اختیار کرنا چاہئیں۔ سرکاری مشینری کو ایسے افراد سے پاک کرنا ہوگا جو ان مقاصد کو ناکام کرنا چاہتے ہوں اور ان افراد کو کام کے مواقع دینا ہوں گے جو ان مقاصد

کی تکمیل کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اسی طرح طلبہ اساتذہ اور قوم کے موثر طبقات میں سے ان افراد کا عملی تعاون حاصل کرنا ہوگا جو ان مقاصد سے ہم آہنگ ہوں۔ اس کے بغیر کشمکش اور جدوجہد کے موجودہ

دور میں اس نظام کی کامیابی سے تین ذیلی حکومت کیلئے ممکن نہیں ہے۔

ہماری مطبوعات

☆	ہمارے تعلیمی نظام میں ضیاع	120 روپے
☆	پاکستان میں نظام امتحانات	150 روپے
☆	یکساں نظام تعلیم	80 روپے
☆	دینی مدارس کا نظام تعلیم	45 روپے
☆	پاکستان میں تعلیم اور نجی شعبہ	70 روپے
☆	پاکستان میں جامعات کی تعلیم	120 روپے
☆	پاکستان میں زریعہ تعلیم کا مسئلہ	140 روپے
☆	قرآن کریم اور نباتیات و زراعت کی تدریس	12 روپے
☆	عمرانی علوم کی تدریس کا نظریاتی پہلو	12 روپے
☆	بلوچستان کے تعلیمی ادارے اور نظم و ضبط کے چند پہلو	12 روپے
☆	پاکستان میں نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل کی حکمت عملی	30 روپے
☆	مسئلہ کشمیر کل، آج اور کل	95 روپے
☆	کشمیر: آزادی کی جدوجہد	250 روپے
☆	ترکستان میں مسلم مزاحمت	21 روپے
☆	مسلم امت: سوویت روس میں	100 روپے

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

Some Publications

Islamization of Laws and Economy	Rs. 150
Pakistan's Security and the Nuclear Option	Rs 100
The Role of Judiciary and the Objectives Resolution	Rs 50
Pakistan: Foreign Policy Debate — The Years Ahead	Rs 350
Ethno-National Movements of Pakistan: Domestic and International Factors	Rs 180
New World Order: Western Fundamentalism in Action	Rs 250
Islamic Resurgence: Challenges, Direction and Future Perspective	Rs 150
The Sabres of Two Easts: An Untold History of Muslims in Eastern Europe Their Foes and Allies	Rs 300
Mass Resistance in Kashmir: Origins, Evolution, Options	Rs 150
Kashmir Today: Perceptions and Reality	Rs 75
The Withering Chinar	Rs 140
Kashmir: Background to the Dispute	Rs 15
Teachers Training: The Islamic Perspective	Rs 250
Education and the Muslim World	Rs 90
Muslim Women and Higher Education: A Case for Separate Institutions for Women	Rs 42
Elimination of Riba from the Economy	Rs 300
Islamic Approach to Development	Rs 40
Economic Teachings of Prophet Muhammad: A Select Anthology of Hadith Literature on Economics	Rs 200
Money and Banking in Islam (Vol I)	Rs 300
Fiscal Policy & Resource Allocation in Islam (Vol II)	Rs 230

Institute of Policy Studies
Nasr Chambers Block 19 Markaz F-7 Islamabad